قرآن کریم اور سنّت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۸۴ شمارہ: ۱۱
ذوالقعدہ: ۱۴۴۲ھ - جولائی: ۲۰۲۱ء
قیمت فی شمارہ: ۴۰ روپے ، زرِسالانہ: ۵۰۰ روپے

مدیر/ مدیر مسئول
مولانا ڈاکٹر عبدالرزّاق اسکندر

نائب مدیر
مولانا سیّد سلیمان یوسف بنوری

مدیر معاون
مولانا محمّد اعجاز مصطفیٰ

ناظم
مولانا فضل حق یوسفی

خط وکتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ ''بینات'' جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن
کراچی، پوسٹ کوڈ: 74800، پوسٹ بکس نمبر: 3465
فون دفتر ''بینات'': 021-34927233

اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: 7-397-0101900 برانچ کوڈ: 00816
مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

یورپ اور امریکی ممالک، وغیرہ: 40 امریکی ڈالر
عرب اور ایشیائی ممالک، وغیرہ: 35 امریکی ڈالر

وضاحت

ماہنامہ ''بینات'' میں اشتہارات کی اشاعت کا مقصد تصدیق اور سفارش نہیں ہے۔ ادارہ معاملات کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147
فیکس: + 92-21-34919531
Web: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk
ناشر: مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر **مطبع:** ایجوکیشنل پریس **طابع:** فیروز زکی

فہرستِ مضامین

بصائر وعبر

اہلِ فلسطین پر ظلم کب تک!؟	۳	محمد اعجاز مصطفیٰ

مقالات ومضامین

لفظِ اللہ، دین اور اسلام کی تشریح .... ایک جامع خطاب	۸	محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ
مکاتیب حضرت بنوریؒ بنام حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ	۲۲	انتخاب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری
وفاق المدارس اور سیاست .... چند ابہامات	۲۵	مفتی رفیق احمد بالاکوٹی
تعویذ کی حقیقت اور اُس کا شرعی حکم!	۳۰	مولانا شفیق الدین الصلاح
فتویٰ اور قضاء میں فرق اور مسئلہ طلاق میں بے احتیاطی	۳۷	مفتی عبداللہ ممتاز قاسمی سیتامڑھی
شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ	۴۷	مولانا محمد عمر نظام آبادی

یادِ رفتگان

امیر الہند حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ	۵۳	مولانا محمد فہیم الدین بجنوری

دارالافتاء

سلام کے مسنون اور مکمل کلمات!	۵۹	ادارہ

نقد ونظر

	۶۲	ادارہ

اہلِ فلسطین پر ظلم کب تک !؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفٰی

سرزمینِ قدس، قبلۂ اول کی بنا پر تمام اُمتِ مسلمہ کا مشترکہ اَثاثہ ہے۔ یہاں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی کثرتِ بعثت کی بنا پر یہ ''سرزمینِ انبیاء'' بھی کہلاتی ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے صاحبزادہ حضرت اسحاق علیہ السلام سے حضرت یعقوب و یوسف، پھر حضرت موسیٰ، زکریا، یحییٰ، داؤد، سلیمان اور بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام تک یہ خطہ انوارِ نبوت سے جگمگا تا رہا ہے۔ پیغمبرِ آخرالزماں خاتم النبیین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہجرت کے بعد ایک مدت تک بحکمِ الٰہی ''بیت المقدس'' کی جانب رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے ہیں، اسی لیے یہ مسلمانوں کا قبلۂ اول کہلاتا ہے۔

معراج کی رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مسجدِ اقصیٰ میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو نماز پڑھائی اور ''امام الانبیاء'' کے شرف سے مفتخر ہوئے اور پھر یہیں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ سفرِ معراج شروع ہوا، جس نے انسانیت کو سرِعرش مہمان نوازی کا اعزاز عطا کیا۔ اس بنا پر اُمتِ محمدیہ کا سرزمینِ فلسطین، مسجدِ اقصیٰ اور بیت المقدس کے ساتھ ایک ایمانی رشتہ قائم ہے۔ یہ رشتہ اتنا اَٹوٹ ہے کہ معلوم انسانی تاریخ میں سوائے ایک صدی (جب صلیبیوں کا یہاں تسلُّط قائم ہوا) کے یہ خطہ ہمیشہ پرچمِ محمدی کے سرنگوں رہا ہے اور یہاں اسلام کی شان وشوکت کا ڈنکا بجتا رہا ہے۔

یہود جو ''مغضوب علیھم'' قوم ہے، پچھلے ستر سالوں سے اہلِ فلسطین پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہی ہے، یوں تو اس قوم کے ہاتھ انبیاء کرام علیہم السلام جیسی مقدس جماعت کے خون سے رنگے ہوئے ہیں، اپنی ہی قوم کے علماء وصلحاء کا خون بہانا ان کا صدیوں سے آبائی پیشہ رہا ہے اور آج یہ فلسطین پر قابض ہوکر، وہاں صدیوں سے آباد مسلمانوں کا قتلِ عام کرکے انھیں نقل مکانی پر مجبور کررہے ہیں۔ یہودیوں کے مختلف جرائم قرآن کریم میں مذکور ہیں، جن میں ''قتلِ انبیاء'' کا تذکرہ بار بار دہرایا گیا ہے۔ انہی جرائم کی بنا پر یہ قوم ذلت وپستی کی پاتال میں اُتاری گئی۔

جنگِ عظیم سے قبل یہود بڑی تعداد میں جرمنی میں آباد تھے، ہٹلر نے ان کا قتلِ عام کرکے باقی ماندہ کو وہاں سے نکالا تو دنیا کا کوئی ملک انھیں پناہ دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس کی وجہ ان کی چالاکی ومکاری، دھوکا دہی وغداری، بے وفائی وناشکری وغیرہ تھی، حتیٰ کہ جب برطانیہ کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ یہ برطانیہ آکر نہ بس جائیں تو اس نے ان سے چھٹکارا پانے اور مسلمانوں کی وحدت کو توڑنے کے لیے ''ایک پنتھ دو کاج'' کے مصداق ارضِ فلسطین میں انھیں بسانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اپنی فطرت کے بموجب انہوں نے فلسطینیوں کی زمین پر قبضہ جمانا شروع کردیا، نوبت بایں جارسید کہ ۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ نے عرب کے سینے میں اسرائیلی خنجر گھونپ کر فلسطین کے دو ٹکڑے کردیئے اور ''اسرائیل'' نامی ناگ قبلۂ اول کے خزانے پر اپنا پھن پھیلا کر قابض ہوگیا۔

ارضِ فلسطین پر قابض ہونے کے بعد ''اسرائیل'' نے آگ وخون کا جو سلسلہ شروع کیا، وہ تاحال جاری ہے۔ اسرائیل ۱۹۵۶ء میں مصر کی نہر سوئز کا مدعی بنا، ۱۹۶۷ء میں اس نے عربوں سے خوفناک جنگ لڑی اور القدس کو محاورتاً نہیں، بلکہ حقیقتاً اپنے ظلم وجبر کی آگ میں جھونک دیا۔ اہلِ فلسطین یہود کے مظالم کا مقابلہ کرنے کے لیے مادی وسائل کی قلت کا شکار ہونے کے باوجود آج تک نبرد آزما ہیں، لیکن مسلم حکمران جو ایٹمی طاقت، تیل کی دولت اور بے شمار وسائل واسلحہ سے مالا مال اور لیس ہیں، اسرائیل سے قبلۂ اول نہیں چھڑا سکے ہیں۔

پہلے تو گاہے گاہے کوئی آواز اُٹھتی سنائی دیتی تھی، لیکن حال ہی میں جب رمضان کے مقدس ماہ کی آخری راتوں میں صہیونی اژدہا مسجدِ اقصیٰ میں مصروفِ عبادت مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا اور تب سے تقریباً دو ہفتے القدس پر آگ وآہن کی بارش ہوتی رہی، میڈیا کی عمارت سے کتابوں کی لائبریری تک، مسجد سے ہسپتال تک سب کچھ تباہ وبرباد کردیئے گئے، بچے، بوڑھے، جوان، مرد وعورت یکساں ان مظالم سے

دو چار ہوئے، فلسطینی شہداء کی تعداد دو سو سے متجاوز ہوگئی، لیکن عالمی اسلامی تنظیموں خصوصاً مسلم حکمرانوں کی بے حسی و بے بسی تماشائے عالم بنی ہوئی ہے، إنما أشكو بثي و حزني إلى الله۔

ان حالات میں پاکستان اور دوسرے اسلامی ممالک کی تنظیم ''او آئی سی'' کا اجلاس بلایا گیا، لیکن اس نے بھی ایک مذمتی قرارداد سے آگے کچھ نہ کیا۔ ہماری حکومت کے وزیر خارجہ جناب شاہ محمود قریشی نے ترکی کے وزیرِ خارجہ سمیت کئی اور اسلامی ممالک کے وزراء خارجہ کو ساتھ ملا کر اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کی اور اقوام متحدہ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اسرائیل کی یلغار کو روکنے کے علاوہ اس پر جنگی تاوان لازم کرے۔ سلامتی کونسل میں یہ مسئلہ گیا تو امریکا نے اس کو ویٹو کر دیا۔ گویا آج بھی امریکا مسلمانوں خصوصاً فلسطینیوں پر ظلم و جور کے پیچھے تھپکی دینے کے لیے کھڑا ہے اور وہ اسرائیل کو تھپکی دے رہا ہے۔ ان حالات میں عالمی حالات اور نظامِ عالم پر گہری نگاہ و نظر رکھنے والے دانشور حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اب وقت ہے کہ مسلم حکمران مل کر تین کام کریں:

۱:۔ تمام مسلمان ریاستیں آپس میں دفاعی معاہدات کریں، جیسا کہ امریکا نے نیٹو طرز پر معاہدہ کیا ہوا ہے کہ اگر کسی ایک ملک پر کوئی حملہ کرے گا تو معاہدہ میں شامل تمام ممالک پر یہ حملہ تصور ہوگا اور وہ سب مل کر اس جارح ملک پر حملہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے اور اقوامِ متحدہ کے منشور میں اس کی اجازت و گنجائش بھی ہے۔

۲:۔ تمام مسلم ممالک بیدار مغزی کا ثبوت دیتے ہوئے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں مضبوط لابنگ کر کے اہلِ فلسطین کو ان کا ملک اور زمینیں واپس کرائیں۔

۳:۔ تمام اسلامی ممالک مل کر سلامتی کونسل میں ایک مسلم نشست حاصل کرنے کا مطالبہ کریں، جس میں صرف پانچ ممالک کی اجارہ داری ہے کہ اگر چار ممالک کسی ملک کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، تو ایک ملک آکر اسے ویٹو پاور کے ذریعہ رد کر دیتا ہے، جیسا کہ حالیہ فلسطین کے معاملے میں امریکا نے کیا۔ جب مسلم ممالک بھی یہ نشست حاصل کر لیں گے تو انھیں بھی حق حاصل ہوگا کہ کسی بھی اسلامی ملک کے خلاف کوئی جارحیت کا سوچے گا تو اسلامی بلاک اس کی مخالفت کرے گا۔

جہاد کا مقصد اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنا اور مظلوم کو ظلم سے نجات دلانا ہے۔ آج ۵۷/ اسلامی ممالک ۲۲ عرب اور ۷ خلیجی ممالک ہیں۔ اگر ان میں اتحاد ہو اور سب کے پیشِ نظر اسلام اور مسلمان اُمت ہو اور ان کا آپس میں اتحاد اور اَیکا ہو تو ایک اسرائیل کیا پوری دنیائے کفر بھی مل جائے تو ان کا

مقابلہ نہیں کر سکتے، لیکن ان کا آپس کا انتشار، ایک دوسرے پر عدمِ اعتماد اور ان کی صفوں میں چھپے ہوئے اغیار کے آلۂ کار اُن کو کبھی کسی مسئلہ پر متحد ہونے نہیں دیتے۔

بہرحال مسلم حکمرانوں کو اپنی مسلمان رعایا اور عوام کے جذبات کو سمجھنا چاہیے اور اُنہی کے مطابق اپنی ملکی پالیسیوں کو وضع کر کے ان پر عمل پیرا ہونا چاہیے، ورنہ دنیا بھر کی مسلم قوم اپنے حکمرانوں کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ ان حالات میں کمزوری دکھانا اور بے بسی کی باتیں کرنا کسی مسلم حکمران کے شایانِ شان نہیں۔

پاکستان اسلام کے نام پر قائم کی جانے والی اسلامی مملکت ہے۔ واحد اسلامی ایٹمی قوت ہونے کی بنا پر تمام عالم اسلام کے مظلوم عوام کی نگاہیں پاکستان کی جانب اُٹھتی ہیں، لیکن افسوس ہوتا ہے کہ ان حالات میں بھی بجائے اُمتِ مسلمہ کو حوصلہ دینے اور ان کے جذبات کی عکاسی کرنے کے ہمارے صدر مملکت محترم جناب عارف علوی صاحب یہ بیان دیتے ہیں کہ:

> ''ہم نے بھی تمام ممالک کی طرح اسرائیلی جارحیت کی بس مذمت کی۔ عالمی سطح پر مسلمان خود کمزور ہیں، اسی لیے ہمیں طاقت ور کی آواز سننا پڑے گی۔ مسلم اُمہ اسرائیل کے خلاف سخت قدم اُٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتی، کیونکہ ہم کمزور ہیں۔''

ایک ایٹمی قوت سے مالا مال ملک کے سربراہ کو ایسا بیان زیب نہیں دیتا۔

البتہ جمعیت علماء اسلام پاکستان کے امیر حضرت مولانا فضل الرحمٰن دامت برکاتہم نے پوری اُمتِ مسلمہ کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے بہت ہی حوصلہ افزا بیان دیتے ہوئے فرمایا: ''اگر ہمیں راستہ دیا جائے تو اپنے فلسطینی بھائیوں کے ساتھ مورچے میں بیٹھ کر جہاد کرنے کے لیے تیار ہیں۔'' یقیناً یہی جذبۂ جہاد جو آج ماند پڑتا جا رہا ہے، اسے بھرپور اُجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔

ارضِ فلسطین کا مسئلہ صرف عربوں کا نہیں، بلکہ کُل اہلِ اسلام کا مسئلہ ہے۔ ''إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ'' (تمام مسلمان آپس میں بھائی ہیں) کے تحت اسلام کے رشتہ نے عرب تا عجم، افریقا تا امریکا اور ایشیا سے انٹارکٹیکا تک بسنے والے تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کے درد و الم میں شریک بنایا ہے۔ اور اسلامی شریعت میں یہ حکم ہے کہ مشرق میں رہنے والے مسلمان پر کوئی ظلم کرے گا تو درجہ بدرجہ مغرب تک تمام مسلمانوں پر اس کی مدد و نصرت کرنا لازم ہوگا، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

''وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ

وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا '' (النساء:۷۵)

ترجمہ: ''اور تمہارے پاس کیا عذر ہے کہ تم جہاد نہ کرو اللہ کی راہ میں اور کمزوروں کی خاطر سے جن میں کچھ مرد ہیں اور کچھ عورتیں ہیں اور کچھ بچے ہیں جو دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو اس بستی سے باہر نکال جس کے رہنے والے سخت ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنے پاس سے (غیب سے) کسی دوست کو کھڑا کیجیے اور ہمارے لیے اپنے پاس سے (غیب سے) کسی حامی کو بھیجیے۔''

مسلم حکمران اگر اپنی ذمہ داری ادا کرنے سے قاصر ہیں تو اُمتِ مسلمہ کے ہر فرد پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی اپنی حیثیت اور دائرہ کار میں اسرائیلی مظالم کے خلاف ضرور آواز اُٹھائے۔ ارضِ فلسطین جو دہائیوں سے لہولہو ہے، جہاں بنیادی انسانی ضروریات بھی ظالم و جابر اسرائیلی فوج کی مرہونِ منت ہیں، جہاں سیّدنا آدم و سیّدنا اسحاق علیہما السلام کا تعمیر کردہ قبلۂ اول قائم ہے، جسے سیّدنا سلیمان علیہ السلام نے تزئین و آرائش سے آراستہ کیا تھا، جو امام الانبیاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت گاہ ہے، اس کی آزادی اور صہیونی چنگل سے رہائی اُمت کے فراموش کردہ فرائض میں سے ایک ہے۔

اگر ہم سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح عملاً جہاد کرنے سے مجبور و محروم کر دیئے گئے ہیں تو اہلِ فلسطین کی مالی مدد کرنا، اُن کے حق میں دعائیں کرنا، اپنے ملک میں احتجاجی جلسے جلوس نکالنا، اپنی تقریر و تحریر میں ارضِ فلسطین کو موضوعِ سخن بنانا اور اسرائیلی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنا، یہ سب ہمارے دائرۂ اختیار سے باہر نہیں ہے، اور باتوفیق مسلمان اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔

۲۱ رمئی ۲۰۲۱ء بروز جمعہ جمعیت علماء اسلام کی اپیل پر ملک بھر میں ''یومِ فلسطین'' منایا گیا، جس میں اہلِ اسلام کی بھرپور تعداد نے شرکت کر کے اہلِ فلسطین کے ساتھ تعلق کا ثبوت دیا۔

خدا کرے کہ یہ کاوشیں کام آئیں اور فلسطین کی سرزمین آزادی کی فضاؤں میں سانس لے سکے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ سیدنا محمد و علیٰ آلہٖ و صحبہٖ أجمعین

لفظِ اللہ، لفظِ دین اور لفظِ اسلام کی تشریح

ایک جامع، علمی اور اصلاحی خطاب

بیان: محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ
ضبط وترتیب: مولوی احمد عبداللہ، متعلم تخصصِ فقہِ اسلامی

''محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری قدس سرہ نے سن ۱۹۷۵ء میں پیرسٹن، انگلینڈ میں لفظِ جلالہ، لفظِ دین اور لفظِ اسلام کی تشریح پر مشتمل ایک جامع، پرمغز، علمی اور اصلاحی خطاب فرمایا تھا، جسے افادۂ عام کی غرض سے کیسٹ سے نقل کر کے کسی قدر ضروری حذف وترمیم کے بعد قارئینِ بینات کے لیے شائع کیا جارہا ہے۔'' [ادارہ]

حق تعالیٰ جلّ ذکرہ نے یہ اعلان فرمایا ہے کہ اب اُمّتِ محمدیہ کے لیے جو طریقہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہے، وہی دینِ اسلام ہے۔ اس کے علاوہ جتنے طریقے اس سے پہلے دنیا کے اندر حق تعالیٰ نے جاری کیے تھے، حضرت سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دنیا میں تشریف لائے ہیں۔ ہر دور میں حق تعالیٰ جل ذکرہ نے ہر امت کے لیے ایک قانون عطا فرمایا ہے، اس قانون کی جو بنیاد تھی وہ تو بہرحال حق تعالیٰ کی توحید، رسالت اور آخرت کا اعتقاد ہے، البتہ جو احکام تشریعی ہیں وہ عبادات ہیں یا معاملات ہیں، ہر زمانے میں حق تعالیٰ نے اس زمانے کے لوگوں کی عادتوں اور مزاجوں کی اصلاح کے لیے جو قانون مناسب سمجھا، وہ عطا فرمایا۔ (وہ اس وقت دین تھا)۔

لفظِ جلالہ کی تشریح اور اس کی قدرت کے عجائبات کا تذکرہ

تین کلمات کی شرح کی ضرورت ہے: ۱:۔لفظِ ''اللہ''، ۲:۔لفظِ ''دین'' اور ۳:۔لفظِ ''اسلام''۔اللہ اس ہستی کا نام ہے جس نے انسانوں کے لیے تمام زمین وآسمان، چاند سورج اور جو نظام اس دنیا کے اندر موجود ہے (وہ بنایا)، (کائنات کا نظام) نہایت ہی عجیب وغریب اور محیّر العقول نظام ہے اور اس نظام کے حقائق واسرار تک دنیا کی عقلیں ابھی تک نہیں پہنچ سکی ہیں، اور نہ ہی پہنچ سکیں گی۔آج بہت بڑے بڑے سائنس دان جتنی ترقی کر رہے ہیں اور جتنا آگے بڑھ رہے ہیں' حق تعالیٰ کی مخلوق اور آسمان وزمین کے حقائق ان پر اُتنے ہی زیادہ منکشف ہو رہے ہیں، تو وہ اپنے جہل کا اعتراف کر رہے ہیں۔حالانکہ حق تعالیٰ کے اسرار، خدائی اسرار اور اس دنیا کے اندر جو عجائبات ہیں، ہمارا بالکل ابھی بچپن کا دور ہے اور ابھی آگے تک جانے کے لیے لاکھوں سال چاہئیں۔

آپ تعجب کریں گے کہ حق تعالیٰ کی مخلوقات میں جو سب سے ذلیل مخلوق ہے، جو سب سے زیادہ کمزور ترین مخلوق ہے، میری مراد حشرات ہیں، یعنی کیڑے مکوڑے، سانپ اور بچھو، زمین پر رینگنے والی چیزیں، آج تمام اہلِ سائنس اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی تحقیقات کے لیے اور ان کے حقائق معلوم کرنے کے لیے، ان کے افعال ومنافع اور خواص معلوم کرنے کے لیے نسلِ انسانی کو دو لاکھ سال کی زندگی مزید چاہیے۔یا اللہ! دو لاکھ سال تو کیڑے مکوڑوں کے لیے چاہئیں تو اللہ کی قدرت کے جو حقائق ہیں، اس کے لیے کتنے سال چاہیے ہوں گے؟! تو اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہستی ہے جس نے اس دنیا کے عجائب خانے کو، اس دارالعجائب کو، اس میوزیم کو کیسا عجیب بنایا ہے کہ آج دنیا اس کو جتنا سمجھتی ہے اور جتنا آگے احوال سے واقف ہوتی ہے اور جتنا حقائق کا انکشاف ہوتا رہتا ہے' وہ اپنے جہل کا اقرار کرتی ہے۔اللہ وہ ذات ہے جس نے اس دنیا کو اتنا عجیب بنایا ہے کہ تمام اولین وآخرین اس کے حقائق ہیں (جس کے مظاہر ختم ہونے والے نہیں ہیں) تو اس کی قدرت کے عجائبات کیسے ہوں گے؟ اللہ نے ہمارے رزق کے لیے کیا کیا ذرائع بنائے، جن کا ہم سوچ بھی نہیں سکتے، اللہ نے جس طریقے سے اس کائنات کو ہم انسانوں کے لیے بسایا ہے اور ہمارے لیے جو کچھ پیدا فرمایا ہے، گویا کہ زمین وآسمان میں عجائبات رکھ دیئے ہیں اور ہمیں عقل دے دی بس، وہ عقل سوچے گی اور دھیان کرے گی۔ عقلِ انسانی کہاں سے کہاں پہنچ گئی؟! اور نامعلوم کہاں سے کہاں پہنچے گی؟! ابھی تو اس عقل نے اتنی ترقیات کر لی ہیں اور ایسی چیزیں بنائی ہیں جنہیں جانتا کوئی نہیں ہے اور بھی وہ کیا کچھ بنوالائیں گے، یہ سب کچھ گویا کہ حق تعالیٰ کی خالقیت کے حقوق بتائے کہ اللہ پاک ایسا خالق ہے کہ عقل کو اللہ نے پیدا کیا

ہے اور عقل کی نفسیات کو بھی اللہ نے پیدا کیا ہے۔

انسان کے اندر روح کو بھی اللہ نے پیدا کیا ہے، وہ روح کیسی ہے؟ آج تک تمام دنیا اس کے حقائق میں حیران ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان میں انگریز کہتے تھے: ''جو چیز آنکھوں سے نظر نہیں آتی، اس کا وجود ہی نہیں ہے۔'' وہ روح کو نہیں مانتے تھے، حالانکہ دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جو نظر نہیں آتیں، میری آنکھ کے بیچ میں جو خلا ہے آپ کو نظر آ رہا ہے؟ کیا نظر آ رہا ہے؟ تو روح کیا نظر آتی؟ اس کے بعد جب تحقیقات شروع کیں تو ایک دور ایسا بھی آیا کہ چار سو انسانوں نے فرانس اور روم کے اندر روح کے بارے میں تحقیق شروع کی اور آخر میں اعتراف کر لیا کہ ایک ایسی چیز موجود ہے جس کی حقیقت ختم نہیں ہو سکتی، حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے تحقیقات کیں اور بہت بڑے سے بڑے وسائل دیکھے اور آج وہ کہاں سے کہاں پہنچے۔

یہ کیسی بدنصیب قوم ہے کہ حق تعالیٰ کے ان بنیادی حقائق کو ماننے کے باوجود ''يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' دنیا کے ظاہر کو جانتے ہیں، دنیا کے بھی ظاہر کو، دنیا کی حقیقت کو بھی نہیں جانتے، ''يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' کچھ ظاہر کو، ''يَعْلَمُوْنَ الظَّاهِرَ'' نہیں فرمایا، ''يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا''، دنیا کے کچھ ظاہر کو جانتے ہیں، ''وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ''، اور یہ بدنصیب آخرت سے بالکل غافل ہیں، کچھ نہیں جانتے کہ آخرت کیا ہے! اس لیے تو آج عقل اُن پر غالب ہے۔

حق تعالیٰ جل ذکرہ نے اس کائنات کو اس انداز کے ساتھ بنایا ہے، اس کا نام اللہ ہے، اس ذات نے جب اس فانی دنیا (وہ دنیا جو توڑنے پھوڑنے کے لیے ہے) میں عجائبات رکھ دیئے ہیں، وہ عالم جو توڑنے پھوڑنے کے لیے نہیں ہے، جو ابدالآباد باقی رہنے کے لیے ہے، جو ہمیشہ رہے گا اور جس کے لیے ہمارے حساب والوں کے ہاں کوئی نظیر ہی نہیں ہے، ارب کہو، کھرب کہو، جو بھی کہو، اس کے لیے کوئی نظیر نہیں ہے، سوائے اس کے کہ نہ ختم ہونے والی زندگی ہے اور وہ بھی حق تعالیٰ جل ذکرہ کے تمام صفاتِ کمال کے سو کے سو حصے ظاہر ہوں گے، دنیا میں اللہ کی صفات میں سے ہر صفت کا سوواں حصہ ظاہر ہوا ہے، قدرت ہے، خالقیّت ہے، رازقیّت ہے، رحمت ہے، رافت ہے، صبر ہے، ان کا سوواں حصہ ظاہر ہوا ہے اور آخرت میں حق تعالیٰ کے تمام سو کے سو حصے ظاہر ہوں گے، اس اللہ نے اُس عالم کو ایسے چھوڑ دیا؟! اس کے لیے حق تعالیٰ جل ذکرہ نے انبیاء کرام (علیہم السلام) کو مبعوث فرمایا، اس کی صفتِ ہادی نے ہدایتِ خلق کے لیے اور کائنات کی ہدایت کے لیے جو ہستیاں بھیجیں، وہ انبیاء و رسل

ہیں، ایسی ہستیوں کا انتخاب فرمایا کہ جو اللہ سے متعلق ہوں اور بندوں کو اللہ کی طرف راستہ بتلائیں۔

انبیاء اور رسل کا معنی ومفہوم اور اس کی تشریح

بات ذرا لمبی ہے، تفصیل تو نہیں سنا سکتا ہوں کہ انبیاء ورسل کیا ہیں؟ حق تعالیٰ اس مرتبے کے لیے اپنے بندوں میں سے ایسے انسانوں کو منتخب فرماتا ہے، جن کا ظاہر و باطن اس دنیا کے اندر بے نظیر ہوتا ہے، جن کا ظاہر بھی بہترین، روح کی صفائی، قلبی صلاحیّت، دماغ پاکیزہ، عقل باکمال، بدن کی طاقت، ظاہری جسمانی قوت میں کمال، یہ سب ان کو حاصل ہوتا ہے، ان کا انتخاب فرماتا ہے، تاکہ میرا پیغام میرے بندوں کو پہنچادیں۔ اس بشر کو دو کمالات عطا فرماتا ہے، اس کو نفس سے اور شیطان سے معصوم کرتا ہے، اس پر نفس وشیطان کا تسلُّط نہیں ہوتا۔ لیکن جو عام انسان ہے، ہم بھی انسان ہیں، اس کے ساتھ نفس بھی ہے، شیطان بھی ہے، اس کا تسلُّط بھی ہے، تو عام انسان معصوم تو نہیں ہیں۔ البتہ اُس ہستی (نبی ورسول) کو حق تعالیٰ نفس کی خواہشات سے بھی اور شیطان کے اثرات سے بھی عصمت فرماتا ہے، معصوم بناتا ہے۔ شیطانی اثرات پیدا تو ہوتے ہیں، لیکن شیطان وہاں سے ذلیل ہوکر، رسوا ہوکر کے چلا جاتا ہے، کچھ نہیں کرسکتا، حتیٰ کہ ایک حدیث میں آتا ہے، صحابیؓ نے پوچھا: یارسول اللہ! آپ کا بھی شیطان ہے؟ فرمایا: میرا بھی شیطان ہے، آخر میں، ''فأسلمَ فلا یأْلُو إلّا بخیر''، وہ منقاد وذلیل ہوگیا، وہ مجھ کو خیر ہی بتلاتا ہے، مجھ کو شر نہیں بتاسکتا، انبیاء کرام بشر تو ہوتے ہیں، لیکن نفس اور شیطان کے اثرات سے معصوم ہیں۔ عصمت کا معنی یہ ہے کہ اس سے گناہ ہو نہیں سکتا، گناہ کی صلاحیت اس میں نہیں، حق تعالیٰ اُنہیں پاک کرلیتا ہے اور ان کو ذریعہ بناتا ہے، ان کے ذریعے پیغامات ہوتے ہیں، براہِ راست اللہ سے ہم کلامی ہوتی ہے اور کبھی فرشتوں کے ذریعے سے اور کبھی کبھی القاء کرتا ہے، کبھی دل میں بات ڈالتا ہے اور بندوں کو اللہ کا پیغام پہنچاتا ہے، ان کا نام ہے انبیاء ورُسُل۔

لفظِ نبی کا ماخذِ اِشتقاق اور معنی

تفصیل تو بہت ہے، لیکن ذرا دو چار لفظ اور کہہ دوں، علماء حضرات موجود ہیں۔ نبی کا معنی کیا ہے؟ علماء نے جو تحقیق کی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ نبی مشتق ہے لفظِ ''نَبَأ'' سے، ''نَبَأ'' کے معنی خبر اور خبر ایسی جس میں فائدہ ہو۔ فائدہ بھی عظیم الشان ہو اور غیب کی بات ہو۔ تو نبی کے معنی ہوں گے (وہ خبر فعیل بمعنی مفعول ہے) ایسی ہستی یا شخصیت جو خبر دے اور خبر فائدے کی ہو، فائدہ بھی عظیم الشان ہو اور وہ بالغیب ہو، عقل سے بات نہ معلوم ہوسکتی ہو، اس کا مطلب یہ ہے: وہ ہستی معصوم ہوتی ہے نفس

وشیطان سے، وہ غیب کی خبریں دیتا ہے، حق تعالیٰ سے تعلق قائم ہوجاتا ہے، بندوں اور اللہ کے درمیان واسطہ ہوتا ہے، ان کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ہدایات بھیجتا رہتا ہے اُمت کو، مخلوقات کو۔ بس اتنی بات سمجھ لیجیے کہ نبی اور رسولوں کا سلسلہ یہ ہے۔ اللہ جل ذکرہ نے ان کے ذریعے سے ہمیں اپنا طریقہ بتلا دیا کہ اللہ کا منشا کیا ہے؟ اللہ کی عبادت کیسی کرنی چاہیے؟ عقیدہ کیا چیز ہے؟ اللہ کی صفات کیا ہیں؟ اللہ کے کمالات کیسے ہیں؟ اللہ کے اسماءِ حسنیٰ کیسے ہیں؟ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ یہ سب کچھ تفصیلات عقل نہیں معلوم کرسکتی، یہ تفصیلات جس نے بتلائی ہیں اُس کا نام دین ہے۔

لفظِ دین کا معنی ومفہوم اور اس کی تشریح

دین کا معنی وہ انسان کے لیے ایک طریقۂ زندگی ہے، جو حق تعالیٰ سے اللہ کے حکم کے مطابق، انبیاء کی ہدایات کے مطابق تعلق قائم کرے، اللہ کے بندوں سے تعلق قائم کرے، اپنوں سے کرے، پرایوں سے کرے، دوست سے کرے، دشمن سے کرے، مسلمانوں سے کرے، کافروں سے کرے، معاملات کرے، اخلاقی تعلق قائم کرے، یہ سب کچھ کا نام دین ہے، تو دین کا معنی ہے انسان کا وہ طریقۂ زندگی جو اللہ کے حکم کے مطابق ہو، جو طریقۂ زندگی اس لیے اختیار کرتا ہے کہ یہ اللہ کی منشا کے مطابق ہے۔ یہ اس دین کا معنی ہے جو بمعنی تمہارا ملّت اور تمہارا طریقۂ کار زندگی میں ہے وہ دین ''الاسلام'' ہے، تو اس کے بعد بات ختم ہوجاتی ہے کہ یہ چیز ہے کہ دین کی باتیں اب عقل سے نہیں معلوم ہوتیں، بلکہ بعض اوقات عقل عاجز ہوتی ہے، عقل خلاف نہیں کرتی، لیکن عقل کی صلاحیت نہیں معلوم کرسکتی، عقل میں بھی جتنی طاقت اللہ نے رکھی ہے، تو جہاں عقل کی سرحد ختم ہوجاتی ہے، تمام اعضاء ہٹ جاتے ہیں، وہاں سے نبیوں کی سرحد شروع ہوتی ہے، تو جو ہدایت اللہ نے انبیاء کے ذریعے سے دی ہے، اس کا نام دین ہے۔

لفظِ جلالہ کے معنی کا حاصل

اب آپ نے اللہ کو پہچان لیا ہوگا کہ وہ ہستی جو صفاتِ کمال کا مالک ہے، وہ واحد ہے، ایک ہے، لاشریک ہے اور قدیم ہے، ازلی ہے، ابدی ہے، وہ عالم بالغیب ہے، وہ سمیع وبصیر ہے، وہ حی و قدیر ہے، کائنات کا مالک ہے، تمام کائنات کو اس نے پیدا کیا ہے، اس نے گویا کہ انسان کے لیے انبیاء کو بھیجا ہے، تاکہ وہ اس دنیا کے منافع کے علاوہ آخرت کے منافع کا مستحق بن جائے۔ دنیا کے منافع سے مطلب یہ ہے کہ طاقت کافی ہے، لیکن اس کے بعد دوسرا جو عالم تھا جس کا نام قیامت ہے، جس کا نام آخرت ہے، اُس سے منافع حاصل نہیں کرسکتا، سمجھ ہی نہیں سکتا، تو بندہ وہاں کیا اور کیسے کرے گا؟ اس

کے لیے اللہ نے انبیاء کو بھیجا ہے، اس کا نام طریقۂ دین ہے۔

لفظِ اِسلام کا معنی ومفہوم اور اس کی تشریح

دو مختلف طریقے تھے ہر زمانے کے اندر، موسیٰ علیہ السلام کے لیے اور دین تھا، انجیل کے اور احکام تھے، تورات کے کچھ اور احکام تھے، اُس سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کے لیے کچھ اور احکام تھے، سلیمان علیہ السلام کے لیے کچھ اور احکام تھے، ہر زمانے کے مختلف رہے ہیں، لیکن حق تعالیٰ نے اُمّتِ محمّدیہ کے لیے جس مذہب کا انتخاب فرمایا ہے اُس کا نام اللہ نے ''الإسلام'' رکھا ہے۔ ویسے ہر مذہب اپنے زمانے میں اسلام ہے، لیکن نام جو ہے اسلام، وہ صرف اِس دین کا ہے، ایک مشکل حل کرنے کے لیے اشارہ کر رہا ہوں، وہ بات بھی لمبی ہے۔ اسلام کے معنی مجھے اب سمجھانا ہے اور اس کی تشریح مجھے کچھ کرنی ہے۔

تکمیلِ دین کے اعلان کا ایک عظیم اور تاریخی دن

''اسلام'' گویا کہ اس دین کا نام رکھا ''الإسلام''، اور یہ اعلان بھی کیا گیا اُس میدان میں جس سے بہتر سرزمین اس وقت میں نہیں تھی، یعنی عرفات کے میدان میں۔ اس دن کیا گیا جس سے بہتر تاریخِ عالم میں کوئی دن آیا نہیں، جمعہ کا دن بھی تھا اور عرفہ کا دن بھی تھا۔ عصر کے بعد کا وقت تھا۔ اس شخص کو کیا جو اوّلین وآخرین کے سیّد، سیّد الاولین والآخرین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ وقت مبارک عصر کا تھا۔ نو تاریخ ذی الحجہ کی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا تریسٹھواں برس تھا۔ آپ کی نبوت کا تیئیسواں برس تھا۔ ذی الحجہ کی نو تاریخ تھی، جمعہ کا دن تھا، عرفہ کا دن تھا، عرفات کی وادی تھی، عصر کا وقت تھا اور آپ اپنی اونٹنی قصواء پر اللہ کی مناجات میں مشغول تھے، وہاں پر اعلان ہوا: ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا''، ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ''، آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا، وہ جو تھوڑا تھوڑا دنیا کے اندر بھیجتے رہے ہر دور کے اندر، اُسے کامل ترین شکل کے اندر (اب بھیجا) اب بات مکمل ہوگئی، اب اس میں کوئی کسر باقی نہیں رہی۔ اب اس میں اتنی بھی (کمی) نہیں کہ تم کسی اور سے جا کر بھیک مانگو، گویا کہ اسلامی قانون کو کوئی نقصان ہے، کوئی کسر ہے، کوئی کوتاہی ہے، اس کو پورا کرلیں (ایسی بات نہیں ہے)، ''اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ''، اشارہ میں نے کر دیا چند باتوں کی طرف۔ ''وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ'' اور نبوت کی، ہدایت کی جو نعمت میں نے دنیا کے لیے مقرر کی تھی، آج میں نے پوری کر دی، بس ختم، اب نہ کوئی ہدایت دینے والا، نہ کوئی رسالت لانے والا، نہ کوئی نبوّت آنے والی، سب ختم ہوگیا۔ اور تمہارے لیے ایک طریقہ مقرر کر دیا گیا، جتنے راستے پہلے کھلے تھے وہ بند کر دیئے گئے، کوئی

مذہب اب دنیا میں باقی نہیں رہے گا، وہ سارے دروازے بند کردیئے، ایک دروازہ کھلا رہے گا ''الإسلام''، ''وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا''، تمہارے لیے اب میں نے ''الإسلام'' کو دین مقرر کردیا ہے، تمہارا دین اب دینِ اسلام ہوگا اور کوئی دین اب نہیں ہوسکتا ہے، یہ تاریخی اعلان تاریخی وقت پر، تاریخی سرزمین پر، تاریخی زمانہ کے اندر اللہ نے فرمایا اور ایک لاکھ صحابہؓ اس کے سننے والے اور مجمع موجود تھا، روئے زمین پر اس سے بہتر مجمع کوئی پیدا نہیں ہوا، اس کا نام ''الإسلام'' رکھا، تو ہمارے دین کا نام ''الإسلام'' رکھا گیا۔

اسلام کے معنی کیا ہیں؟ اسلام کے معنی تو یہ ہیں کہ اپنا آپ کسی کو سونپ دینا، حوالہ کردینا۔ حق تعالیٰ نے اس دین کا نام دینِ اسلام رکھا، گویا کہ ایک قسم کا وعدہ ہے مسلمان کے ساتھ، جس کا معنی یہ ہوگا کہ اس نے اپنے آپ کو ''مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ''، اس نے اپنی جان اور مال کو اللہ کے حوالہ کردیا، اس نے اپنی جان کو بھی حوالہ کردیا، اپنے مال کو بھی حوالہ کردیا، اپنے وقت کو بھی حوالہ کردیا، تو گویا کہ اسلام کے معنی یہ ہیں، اس دین کا نام اسلام ہے، اس دین کا تقاضا یہ ہے کہ وہ شخص سر سے پیر تک اپنے آپ کو ہمہ تن حق تعالیٰ کے حوالہ کردے کہ میں تیرا بندہ، تو میرا خالق، تو میرا رازق، میں تیرا غلام و تیرا بندہ ہوں، اب میری جان تیری، تھی ہی تیری دی ہوئی، میرا تو کوئی حق نہیں ہے، تو گویا کہ اسلام کا معنی یہ ہوگیا کہ ہم نے جان، مال اور وقت اللہ کو دے دیا ہے۔

یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ جان اس کی دی ہوئی تھی، جان کس نے پیدا کی ہے؟ حق تعالیٰ نے پیدا کی ہے اور کیسے پیدا کی؟ کیسی پیدا کی؟ دو چیزیں ہیں اس کے اندر، ایک جسم ہے اور ایک روح ہے۔ جسم تو یہ ہے کہ تم نے کچھ کھانا کھالیا، پیٹ میں ڈال دیا، کھانا پانی آیا، وہ چھ سات گھنٹے کے اندر خون بن گیا، وہ خون کدھر پہنچ گیا؟ ہاتھ میں پہنچ گیا، وہ ہاتھ سے کہیں اور جاکر کسی اور جگہ پہنچ گیا، سفید چیز بن گئی، وہ سفید چیز ایک جگہ پہنچ جائے گی، چھوٹی سی چیز ناپاک جگہ پہنچ جائے گی، اللہ پاک نے اس جگہ تک پہنچا کر چند مہینوں کے اندر ایک جیتا جاگتا انسان بنادیا، جی اِتنا کرم! یہ کس نے نظام بنایا؟ یہ پیٹ کس نے بنایا؟ کس نے معدہ بنایا؟ کس نے جگر بنایا؟ کس نے دل بنایا؟ کس نے قطرہ خون کا، پھر خون سے منی بنادیا؟ کئی قطرے خون سے ایک قطرہ منی کا بنادیا اور کہاں سے کہاں پہنچادیا اور وہاں کیسے پرورش کی؟ اُس تنگ و تاریک جگہ کے اندر، اُن ظلمات کے اندر کیسے پرورش کی؟ کیسے انتظام کیا اور کیسے خوبصورت بچہ پیدا کردیا اور اس کے اندر کیسے جان ڈال دی؟ روح جو ہے اس کے پاس ہے، عقل حیران، اس کی تفصیلات کو بیان نہیں کرسکتی تو روح بھی اللہ کی، جان بھی اللہ نے پیدا کی ہے، اس کا کرم ہے کہ یہ جان ہمیں دیتے ہیں کہ ہم مکلّف ہیں، ہم مالک ہیں، اسی کی جان تھی، اسی کی بنائی ہوئی

تھی، اس کے بعد پھر چودہ پندرہ سال میں جان دے دیتے ہیں اور ہم نے کچھ کمایا؟ مال کمایا تو مال کیسے کمایا؟ یہ تمہارے دل میں جو ارادہ آیا، وہ ارادہ کس نے دیا؟ تمہاری آنکھوں (نے دیکھا)، دماغ نے سوچ کر کام کیا، ہاتھوں سے اُٹھایا، پاؤں سے چلے، دماغ سے سوچا اور دکانداری کی، یہ ہاتھ کس نے دیئے؟ پاؤں کس نے دیئے؟ دماغ کس نے دیا؟ آنکھ کس نے دی؟ اور کان کس نے دیئے؟ سوچ کس نے دی؟ ارادہ کس نے دیا؟ توفیق کس نے دی؟ صحت کس نے دی؟ تندرستی کس نے دی؟ اللہ نے، تو سب کچھ اسی کا ہے، یہ بھی اس کا کرم ہے کہ باوجود اس سب کچھ کے کہ سب کچھ ان کا ہے، پھر ہم کو مالک بنایا جاتا ہے، پھر ہم سے سودا کرتا ہے۔

سورۂ توبہ کی ایک آیت کی روشنی میں اسلام کے معنی کی وضاحت

اب اسلام کا معنی سمجھیں گے، سورۂ توبہ کے اندر ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ.'' عجیب انداز سے بڑا وعظ ذکر کیا، فرماتے ہیں: بلاشبہ اللہ نے خرید لیا، ''مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ'' مسلمانوں سے، ''اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ'' ان کے جانوں مالوں کو، ''بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ'' کہ ان کو جنت ملے گی۔ یا اللہ! اللہ خریدار ہے، مال اس کا ہے، دل اس کا ہے، مخلوق اس کی ہے اور ہم کو مالک بنا کر ہم سے سودا کرتا ہے کہ تم مالک بنو، تم سے خریدتے ہیں، اللہ خریدار تو ہم بیچنے والے۔ اچھا بیچنے والے کس چیز کو؟ اُس جان و مال کو، کس جان و مال کو؟ کس زندگی کو؟ جس میں سراپا پریشانی، حزن، غم، تکلیف، درد، تعصّب، تحسّد۔ وہ زندگی، ایسی زندگی؟ جان و مال تو ہمارا ہے، آج بیوی کا انتقال ہوگیا اور آج بچے کا انتقال ہوگیا، اور آج بیوی کا آپریشن ہو رہا ہے، آج گردوں کا آپریشن ہو رہا ہے، آج یہ ہو رہا ہے، آج وہ ہو رہا ہے، آج بخار چڑھا ہے، آج سر میں درد ہے، آج ڈاکٹر کی ضرورت ہے، توبہ توبہ!! آج نقصان ہوا، آج ذرا تھوڑا سا بڑھ گیا، آج حکومت نے یہ الزامات کر دیئے، ہمارا لائسنس بند کر دیا، آج وہ، وہ، وہ۔

دنیا اور جنت کی زندگی اور نعمتوں میں موازنہ

ساری دنیا پریشانیوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے اور اس میں زندگی کتنی؟ پچاس ساٹھ سال۔ کتنا بڑا کرم ہے کہ پچاس ساٹھ سال کی زندگی فانی، جو بھری ہوئی ہو اَعذاب سے، اَعذار سے، حالات سے، اوجاع سے، مصائب سے، اَفکار سے، دردوں سے، غموں سے، کربوں سے، بے چینی سے، ذلتوں

سے، اللہ تعالیٰ ہم سے ایسی معمولی چیز (اس زندگی کو) جنت کے بدلے میں خریدتا ہے، یا سبحان اللہ!! اللہ نے کتنا بڑا کرم فرمایا کہ اس کا جنت کے بدلے میں خریدار ہے، کیا نسبت دنیا کی اور کیا نسبت جنت کی؟! کیا نسبت ہے دنیا کی نعمتوں کی اور کیا نسبت ہے جنت کی نعمتوں کی؟! یوں تو سنا ہوگا قرآن تو بھرا پڑا ہے اور عجیب عجیب تفصیلات آتی ہیں اور جو سب کو جمع کیا جائے تو انسان کی عقل حیران رہ جاتی ہے۔

پہلی زندگی تمہاری دنیا میں کتنی ہے؟ پچاس سال، ساٹھ اور پچاس ساٹھ میں کوئی بچپنا گزرتا ہے، کوئی نیند میں گزرتا ہے، خیر پچاس ساٹھ سال، سو سال زندگی ہے۔ آخرت کی زندگی کتنی ہوگی؟ لاکھ، کروڑ، ارب، کھرب، کوئی حساب ہی نہیں، اچھا یہ زندگی ہے دنیوی، وہاں تمام سکون کی اور تمام راحت والی زندگی، اس زندگی کے اندر عزّت ہے، ذلّت نہیں، اس کے اندر بقاء ہے، فناء نہیں، اس زندگی کے اندر علم ہے جہل نہیں، اس زندگی کے اندر راحت ہے تکلیف نہیں، یا اللہ! ایسی زندگی ہے۔

اچھا! مجھے بتاؤ تمہارا اس دنیا کے اندر کوئی ایسا بادشاہ ہے؟! آج یہ پورا عالم ہے، جس کا محیط چوبیس ہزار اسکوائر فٹ ہے اور جس کا یہ قُطُر ہے آفتاب نکلنے کے لیے، تیرہ ہزار میل کچھ ہے، جی یہ چھوٹی سی دنیا، کوئی بادشاہ ہے جو اس پر حاکم ہو؟! تم اس کو لے لو، ابوجہل کو لے لو، برطانیہ کو لے لو، وہ برطانیہ جس کا سورج غروب نہیں ہوتا تھا، بدنصیب مرحوم آج جا کر تو دنیا میں بند ہوگیا، اس میں اس کو وہ کچھ بھی حاصل تھا جو اور دنیا میں نہیں تھا، اس جیسی کوئی بادشاہی نہیں تھی اور آج دنیا دو سو بادشاہتوں کے اندر تقسیم ہوگئی ہے، دو سو پر؟! چھوٹی دنیا ہے، جو تمہارے پاس ہے۔ اور جنت میں کیا ہوگی؟ ادنیٰ سے ادنیٰ جنتی کو دنیا کی دس گنا جگہ ملے گی۔

آخری جنتی کو ملنے والی جنّت کا ذکر بخاری کی روایت کی روشنی میں

ادنیٰ سے ادنیٰ جنتی کو دنیا کی دس گنا جگہ ملے گی، یا اللہ! ادنیٰ جنتی کا مطلب کیا ہے؟ اس کا تفصیلی تذکرہ حدیثوں میں ہے، ''آخر دخولِ الجنّة'' جو سب سے بعد میں جنّت میں جائے گا، یعنی وہ ہزاروں سال دوزخ میں جلے گا، تکلیف برداشت کرے گا، یہ وہ جنتی ہوگا، أعاذنَا اللهُ وإيّاكم۔ وہ سخت گھڑی برداشت کرے گا، پھر جب اللہ کی رحمت حاصل ہوگی تو اس وقت کہے گا: یا اللہ! اے ارحم الراحمین! عقیدہ اچھا ہوگا، لیکن عمل اچھا نہیں ہوگا، منکراتِ شرائع بہت کیے ہوں گے، اس کی سزا میں جلے گا دوزخ میں، وہ عرض کرے گا: یا اللہ! میرا چہرہ جل گیا، بدن سارا جل گیا، مجھ پر اتنا رحم فرمادو کہ میرا چہرہ جو ہے دوزخ سے باہر کی طرف ہوجائے، تاکہ دوزخ کی تکلیف میں چہرہ نہ جائے، اللہ فرمائیں گے: بندہ! اور کچھ نہیں مانگے گا؟ کہے گا: بس اللہ! اتنا ہی مانگوں گا، کہے گا: قسم؟! وہ قسم کھا کر

کہے گا: تیری عزت وجلال کی قسم! بس میں اور کچھ نہیں مانگوں گا، بس میرا چہرہ دوزخ کی گرمی سے بچ جائے، چہرہ بچالیا جائے گا، باقی دوزخ میں کر دیا جائے گا، سالوں ہزاروں سال گزر جائیں گے، پھر کہے گا: یا اللہ! مجھے دوزخ کے دروازے کے ذرا آگے کر دو، اے بندہ! تو نے تو ابھی قسمیں کھائی تھیں اور تو نے کہا تھا: میں اور کچھ نہیں مانگوں گا، ابھی اور مانگتا ہے؟! اب کہے گا: یا اللہ! مجھے معاف کر دے، مجھے شقی مت بنا دے، یا اللہ! مجھے بد بخت اور بدنصیب مت بنا، یا اللہ! مجھے دوزخ کے دروازے تک پہنچا، فرکّز رکّزۃً، جب دروازے تک پہنچے گا وہاں کھڑا رہے گا، کچھ تیزی سے بچ جائے گا، پھر بعد میں چپ رہے گا خاموش، ہزاروں سال، پھر کہے گا: یا اللہ! مجھے ذرا جنت کے دروازے تک پہنچا دے، اے بندہ! ماأکذبَك ؟! بڑا جھوٹا ہے! بڑا غبن کرنے والا! تو نے قسمیں کھائی تھیں اور تو نے کہا تھا آئندہ اور کچھ نہیں مانگوں گا، اب اور مانگتا ہے؟!

یہ قصہ بخاری کی حدیث میں آتا ہے، افسانہ نہیں ہے۔ بخاری کی حدیث میں الفاظ آتے ہیں جس کا ترجمہ سناتا ہوں۔ خیر! معاملہ یہاں تک کہ جنت کے دروازے تک چلا جائے گا، جب جنت کے دروازے تک چلا جائے گا اور دیکھے گا اَو ہو! یہاں تو ایسی راحتیں ہیں، ایسی عزتیں ہیں، باغ و بہار ہیں، ایسے عجیب چمن ہیں اور درخت ہیں اور پھول ہیں اور خوشبودار چیزیں ہیں!! کچھ تھوڑا سا جھانک کر دیکھ لے گا، پھر چپ، خاموش رہے گا، وعدہ کر چکا ہے، سال ہا سال گزر جائیں گے، پھر کہے گا: یا اللہ! مجھے اندر جگہ دے دے، یابني آدم! ماأکذبَك؟ تو نے قسمیں نہیں کھائی تھیں؟ پھر معافی؟ یا اللہ! مجھے معاف کر دے، مجھے شقی مت بنا دے، مجھے جگہ دے دے، حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بھڑکے گی، تعیین نہیں ہے، اس کی رحمت ایک جزء نہیں کہ تعیین ہو، فرمائیں گے: جاؤ! جنت میں، ادخلِ الجنّۃ، جب چلا جائے گا، شروع میں جنت ہے، وہاں جگہ ہے، وہاں جگہ ہے، خیر واپس آئے گا اور واپس آکر کہے گا: یا اللہ! وہاں تو جگہ نہیں ہے؟! اللہ تعالیٰ کہے گا: جا تو! کتنی جگہ ہے، جا! میں نے تجھے دنیا جتنی اس جنت کے اندر جگہ دی ہے، وعشرۃُ أمثالِھا اور دس گنا اور جگہ دی ہے، اللہ اکبر! اس جنتی کے بارے میں میں نے کہا کہ سب سے آخر میں جانے والا ہوگا، اس کو دنیا سے دس گنا زیادہ جگہ ملے گی، ہے کوئی بادشاہ دنیا کے اندر کوئی اور بھی؟

جنت کے محلّات، خدّام اور اشیاءِ خورد ونوش کا ذکر

اچھا! تم تاریخ عالم سے، اسکندر سے صدرِ اعظم اور آخر تک پوچھو، پوری دنیا میں کوئی ایسا

بادشاہ گزرا ہے جس نے مکانات ایسے بنائے ہوں کہ ایک اینٹ سونے کی ہو، ایک چاندی کی ہو؟! ہے کوئی؟! جنت کے محلّات جو ہوں گے ایک اینٹ سونے کی ہوگی اور ایک چاندی کی ہوگی۔ دنیا میں تم نے کبھی ایسا بادشاہ بھی دیکھا ہے؟ وہ گویا کہ اپنے چمنوں کے اندر، اپنے فرشوں کے اندر، زمین کے اندر ایسا قصر بنائے، وہ قصر کیسے بنے گا؟ دنیا میں تو سوچو! حق تعالیٰ جل ذکرہ نے جنت کے اندر، ایک قصر ہے جس کی زمین سے بلندی ساٹھ میل ہوگی، یہ ہے ارتقاء اللہ، ایسا قصر کوئی دنیا میں ہے؟! خادمات کیسی دیں گے؟ اگر ایک خادمہ کا رُخ دنیا کی طرف ہوجائے تو سورج کی روشنی ماند پڑ جائے، اللہ اکبر! یہ جنت کی نعمتیں ہیں! کھانے کیسے ہوں گے؟ ادنیٰ جنتی کے دسترخوان پر ستّر قسم کے کھانے ہوں گے، ہر لقمے کی نئی لذت ہوگی، نئی ایک طرابت حاصل ہوگی، یا سبحان اللہ! یہاں تو ایک لقمہ زیادہ کھائے تو ڈاکٹر صاحب کی ضرورت، وہاں زیادہ کھاؤ، سب ہضم ہوگا، نہ پیشاب، نہ پاخانہ، خوشبودار پسینہ بدن سے نکلے گا، سبحان اللہ، یہ ہے جنّت کی نعمت۔ جی!

اور وہاں اللہ نے فرمایا: ''وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ'' آج امام صاحب نے جو آیت پڑھی، وہ اس لیے نہیں کھاتے ''وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ'' وہاں جنت کے اندر جو تمہارا جی میں آئے، ''وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ'' جو تم مانگو، یہ اس ذات کی مہربانی ہے تمہارے اوپر جو کریم ہے، جو تم مانگو، جو تم چاہو وہاں تم کو دیا جائے گا اور اس کی تفصیل حدیث میں آتی ہے: ''أعددتُ لعبادي الصّالحين ما لاعينٌ رأت ولاأذنٌ سمِعت ولا خطرَ علىٰ قلب بشر'' میں نے تیار کیں اپنے بندوں کے لیے، نیک بندوں کے لیے جنت کے اندر وہ نعمتیں ''مالاعينٌ رأت'' جو کسی آنکھ نے دیکھی بھی نہیں، کسی بھی آنکھ نے، وہ امریکہ کی یا برطانیہ کی آنکھ ہو، روس کی آنکھ ہو، یا فرعون کی آنکھ ہو، ہامان کی آنکھ ہو، کسی آنکھ نے دنیا میں، بڑے سے بڑے بادشاہ دبدبے والا جو گزرا ہو، اس کی آنکھ نے بھی نہیں دیکھیں وہ نعمتیں، چلو آنکھ کی بات نکل گئی، سن لیتے ہیں کیسی باتیں ہیں؟ فرمایا کہ: ''ولا أذنٌ سمِعت'' نہ کسی کان نے وہ نعمتیں سنی ہوں گی، چلو سنی نہیں تو دل میں خیال آئے گا، نہیں ''ولا خطرَ علىٰ قلب بشر'' ان نعمتوں کا دل میں تصور بھی نہیں آسکتا، خبر دی ہوئی ہے رسول اللہ (ﷺ) نے۔

یہ نعمتیں تمہارے لیے سو سال نہیں، ہزار سال نہیں، لاکھ سال نہیں، کروڑ سال نہیں، ارب نہیں، کھرب نہیں، بلکہ نہ ختم ہونے والی زندگی کے اندر یہ مادی نعمتیں ہوں گی اور جو روحانی نعمتیں ہوں گی، وہ تفصیلات چھوڑ دو، نہ تم روحانی نعمتوں کو جانتے ہو، نہ مادّی کو، تو بتلاؤ یہ دنیا اور وہ، کوئی نسبت ہے؟ تم

سوچو نا، غور کرو، کوئی نسبت ہے؟ حدیث میں تو آتا ہے کہ یہ ساری دنیا اور جو کچھ جی چاہے اس میں ہے دیکھ لو تو ساری زندگی اِس کو چھوڑ دو اور رات دن جنّت میں رہو۔ فرمایا کہ: ''لو کانتِ الدُنیا تعدِل عندَ اللہ جَناحَ بَعُوضةٍ ما سقی الکافرَ منها شربةَ ماء''، اگر حق تعالیٰ کے نزدیک اس دنیا کا وزن ایک مچھر کے پر کے برابر ہوتا تو کافر کو ایک گھونٹ پانی نہ پلاتا۔ حدیث میں آتا ہے ایک سمندر ہے، سمندر میں تم انگلی ڈبودو ''فَلینظُر بِمَ یرجع الإصبع'' تاکہ جو تمہاری انگلی میں لگا ہے وہ تمہیں اس نے دیا، آگے سمندر ہے، وہ دیکھو! حق تعالیٰ کے قربان جایئے! کیسا سوال ہے؟ جان اس کی دی ہوئی، مال اس کا دیا ہوا، وقت اس کا دیا ہوا، ابدالآباد کی جنت کے مقابلے میں وہ ہم سے اس غم خانے کو خریدتا ہے۔

اُمّت کی ذلّت ورسوائی کا ایک سبب

''''اِنَّ اللہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ'' اللہ پاک نے خرید لیا مسلمانوں سے، ان کے جانوں کو، مالوں کو، ''بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّةَ'' کہ ان کو جنت ملے گی، جب خرید لیا ہے اب جہاد کرتے ہیں، ''یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللہِ'' اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے، ''فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ'' ماریں گے تو غازی بنیں گے اور نہیں تو شہید ہوں گے۔ افسوس! آج بدنصیبی ہماری کہ آج اس نعمت سے ہم محروم ہوگئے، آج ہم ذلیل ہوگئے اور ذلیل اس لیے ہوگئے کہ ہم نے جہاد کو چھوڑا، اگر ہم جہاد کو نہ چھوڑتے تو آج دنیا میں اقتدار ہمارا ہوتا۔ اللہ نے فرمایا تھا: ''وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللہِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِھِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَھُمْ ۚ اَللہُ یَعْلَمُھُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فِیْ سَبِیْلِ اللہِ یُوَفَّ اِلَیْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ'' جہاد کے لیے حکم دیا کہ تیاری کرو اور تم مظلوم نہیں بنو گے، با اقتدار بنو گے، ظالم تم پر مسلّط نہیں ہوگا، ہم نے جہاد چھوڑ دیا، اللہ نے ہمیں گھسیٹ لیا، عزت بھی ختم، ذلت آگئی، راحت بھی ختم، مصیبت آگئی، اور جو کچھ تھا وہ سب کچھ ہم سے چھین لیا گیا، جو سلطنتیں تھیں چھین لیں۔

یہ اللہ پاک نے جو تم سے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں جنت ملے گی ''وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا'' یہ اللہ کا وعدہ ہے سچّا، یا اللہ! وہ پہلی بات کوئی کم تھی جو اللہ کی بات، قرآن کی بات اور قرآن سے بڑی کوئی بات ہے؟! اس میں کوئی شک کرتا ہے؟ انسان شک کرے تو کافر ہوجائے، لیکن اللہ پاک نے اس کی اور تائید فرمائی، ''وَعْدًا عَلَیْهِ'' یہ اللہ کا وعدہ ہے، ذمہ ہے اللہ پر اور پھر فرمایا: ''حَقًّا'' سچّا وعدہ ہے، پھر فرمایا: ''فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ''، یہ وعدہ جو ہے اللہ کا تمام آسمانی کتابوں کے اندر ذکر ہے، تورات میں بھی ذکر ہے، انجیل میں بھی ذکر ہے، قرآن میں ذکر ہے، یا اللہ! تو گویا کہ تمام وحی اور

آسمانی کتابیں شاہد ہیں اس بات کی کہ اللہ پاک نے وعدہ سچّا کرلیا مسلمانوں سے، فرمایا: ''فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمْ''، اب تم خوش ہوجاؤ ہمارے سودے کے ساتھ کہ کتنا بڑا سودا ہے، جب صحابہ کرامؓ نے سنا تو چیخ اُٹھے کہ ''تجارةٌ رابِحةٌ، تجارةٌ رابِحةٌ''، کتنی بڑی تجارت، عظیم تجارت ہے، اَجی وقت کا بزنس ہے، کتنا کامیاب! ''فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ''، جو تم نے اللہ سے سودا کیا، وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ، یہ ہے بڑی کامیابی۔

اسلام کے معنی کا حاصل

اسلام کا معنی اب ظاہر ہوگیا کہ اپنا سب کچھ ہم نے اللہ کو دے دیا، اللہ نے خرید لیا، ہم نہ جان کے مالک، نہ مال کے مالک، یہ ہماری حماقت ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم مالک ہیں۔ اب کوئی یہ بات نہ کرے کہ اب زمانہ ایسا آگیا کہ ہم سے جان کا بھی مطالبہ ہے، تھوڑا بہت مال کا مطالبہ کبھی کبھی ہوتا ہے کہ کچھ زکوٰۃ دے دو، کچھ خیرات دے دو، کچھ صدقات دے دو، کچھ تبرّعات دے دو، کچھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ اور وقت بھی، کیا وقت ہے؟ بہت ہوا، اللهُ أكبر اللهُ أكبر اور حَيَّ على الصّلاة، حَيَّ على الصلاة، آجاؤ! نماز کی طرف، سب کام کرو، پھر جاؤ، بس جاکر کے چار رکعت پڑھ لو، پانچ نمازوں میں دعوت دی ہے، کتنا وقت لگتا ہے پانچ نمازوں میں چوبیس گھنٹے میں؟ سارا ملالو تو ایک گھنٹہ بھی نہیں بنتا، اور زیادہ نوافل تمہاری حضوری کی شان اور زیادہ کردو، پانچ نمازیں ہیں، اتنا وقت تو نہیں، اور بہت کچھ کیا، تیر مارا تو حج پر چلے گئے، آخر میں، کچھ زمزم پی لیا، کچھ طواف بھی کرلیے اور کچھ حج کرلیا، بس اور کچھ تم نے کونسا وقت صرف کرلیا؟ یہ اس کا کرم ہے کہ یہ بھی مقبول ومنظور ہے۔ تو غرض کہ گویا اسلام کے معنی کہ ہم نے اپنا سب کچھ اپنی سمجھ کے مطابق اللہ کے حوالے کردیا، اس لیے اس دین کا نام دینِ اسلام ہوگیا۔

سورۂ توبہ کی ایک اور آیت کی روشنی میں اسلام کے معنی کی وضاحت

ایک اور جگہ قرآن مجید میں ایک اور آیت ہے، جو اس سے بھی واضح ہے، فرمایا: ''قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ'' بڑا عجیب اللہ نے وعظ فرمایا، فرمایا کہ آپ علی العموم اعلان کردو، کہو ان مسلمانوں سے، انہوں نے سارے مراحل دیکھ لیے، ساری کائنات دیکھ لی، پھر بھی اعلان کردو، ''اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ'' اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے

''وَاَزْوَاجُكُمْ'' تمہاری بیویاں، تمہاری بہو ''وَعَشِيْرَتُكُمْ'' تمہارا کنبہ قبیلہ ''وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا'' تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں ''وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا'' تمہارا وہ بزنس جس کو تم نے بیچا ہے، کہیں نقصان نہ ہو جائے ''وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ'' تمہارے وہ محلات اور قصور جن کو تم بہت پسند کرتے ہو ''اَحَبَّ اِلَيْكُمْ'' اللہ اور رسول سے زیادہ محبوب ہے اور ان کی محبت مانع آتی ہے دین کے کام کرنے سے کہ یہ میرا بیٹا ہے، یہ کیا کرے گا؟ میرا باپ بوڑھا ہے، یہ کیا کرے گا؟ میری بیوی تنہا رہ جائے گی، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں مر جاؤں، جہاد کروں، شہید ہو جاؤں، یہ بیوہ ہو جائے گی، کیا کرے گی؟ اور میرا اپنا قبیلہ کیا کہے گا؟ یہ کنبے یہاں رہ جائیں گے، فرمایا کہ سب چیزیں اگر خدا اور رسول سے مقدم ہیں ''فَتَرَبَّصُوْا'' پھر اس انتظار کرو کہ تمہارا کوئی فیصلہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ فاسق و نافرمان قوم کو توفیق نہیں دیتا۔

دنیا کے اندر جتنی چیزیں ہوتی ہیں یہی مانع ہو جاتی ہیں کہ بیوی ہے، باپ ہے، بیٹا ہے، کنبہ قبیلہ ہے، بھائی ہے، انڈسٹری ہے، تجارت ہے، مکانات ہیں، موٹریں ہیں، فرنیچر ہے، یہ راحتیں اور آسائشیں ہیں، اگر اللہ اور رسول سے زیادہ محبوب ہیں ''فَتَرَبَّصُوْا'' پھر اس کا انتظار کرو کہ ''حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ'' جب یہ ہو گیا اور (دنیا کی چیزیں) زیادہ محبوب ہو گئیں، اللہ نے یہ کچھ کر دیا، اب ذلیل ہو رہے ہیں، اب مسلمانوں کی پچاس قوتیں ہیں، سب ذلیل، سب رسوا، سب حیران، سب پریشان، اللہ نے مال بھی دیا، دولت بھی دی، حسن بھی دیا، ہمت بھی دی، لیکن یہ سب کچھ کیا ہو گیا۔ تو اب اسلام کا معنی واضح ہو گیا اور یہ ہمارے دین کی بنیاد ہے: ''لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَاۗدُّوْنَ مَنْ حَاۗدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَاۗءَهُمْ اَوْ اَبْنَاۗءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ''

غرض کہ بہت سی جگہ قرآن کریم میں اس موضوع کو واضح کیا گیا کہ مسلمان کے لیے کوئی چیز مانع نہ ہونا چاہیے، اللہ کی محبت سب پر غالب، نہ جان، نہ مال، نہ بیوی، نہ بچے، اسلام کی تاریخ میں کیا کچھ قربانیاں دی گئیں، تو اسلام کا معنی یہ ہو گیا کہ اپنا سب کچھ ہم نے اللہ کو دے دیا، اللہ اس کا مالک ہے، بات سمجھے؟! اللہ نے ہمارے دین کا نام دینِ اسلام رکھا تو فرمایا: ''اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ'' دین تو حق تعالیٰ کے نزدیک ''الإسلام'' ہے، یہ کامل دین ہے، اس میں کوئی کسر باقی نہیں۔

وآخرُ دعوانا اَنِ الحمد للهِ ربِّ العالمين

مکاتیب حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ

بنام حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ

انتخاب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

حضرت علامہ محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ بنام حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۵ھ

عالی مناقب ومفاخر حضرت شیخ الحدیث زادھم اللہ نفعًا وفیضًا وفضلًا، آمین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے مزاج اقدس بخیریت ہوں اور آنکھ میں روشنی پوری آ گئی ہو، اور آپریشن کامیاب ہو، اور آپریشن سے جو ضعف ہوتا ہے حق تعالیٰ اس سے حفاظت فرمائے، آمین۔

مولانا علی میاں صاحب کی خدمت میں میرا عریضہ جو آپ کی خدمت میں لکھا تھا نقل کر کے بھیجنا درست نہ ہوگا، بیوقوفی سے آپ کی خدمت میں اپنے تأثر کا اظہار کیا، ان کو نفع نہ ہوگا اور شاید موجبِ بُعد ہو، اس لیے بہت اچھا کیا کہ ارسال نہیں فرمایا۔ ''حجۃ الوداع''(۱) پر مقدمہ (۲) شروع کیا ہے، کچھ تمہید تو صرف زینت کے لیے اور ناظرین کی تطییبِ خاطر کے لیے گھسیٹ دی ہے، اگر تین چار گھنٹے مزید آج مل جائیں تو

(۱) حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''حجۃ الوداع وجزء عمرات النبي'' مراد ہے، جس کے کئی طبعات شائع ہوئے اور اب کچھ عرصہ قبل مولانا ڈاکٹر ولی الدین بن تقی الدین ندوی حفظہ اللہ کی تحقیق وتخریج کے ساتھ دار القلم دمشق سے عمدہ ایڈیشن چھپ چکا ہے۔

(۲) حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مقدمہ ''المقدمات البنوریة'' کے ضمن میں طبع ہو چکا ہے، ان شاء اللہ! جلد ہی اس کتاب کا جدید طبع مجلس دعوت وتحقیق اسلامی جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن سے شائع ہوگا۔

پورا ہوجائے گا۔ ''مِنہیات'' یا ''مِنہوات'' سے آپ کی طبیعت مبارک خوش ہوجائے گی، اور اس ''سواد في بیاض'' سے اصلی مقصود بھی یہی ہے، ورنہ دماغ بے حد مشغول (ہے) اور منتشر اشغال نے پریشان کردیا ہے، آفتاب کو چراغ کیا دکھایا جائے گا؟!

والد محترم آج کل بظاہر لمحاتِ حیات سرعت سے پورے کررہے ہیں، علیل ہیں، پریشانی اس کی ہے کہ نہ غذا باقاعدہ، نہ دوا باقاعدہ یا بے قاعدہ، بالکل ترکِ اسباب پر اصرار فرمارہے ہیں، اس لیے جو سہارا مل سکتا ہے، وہ نہیں ہے۔ اب صرف دعا اس کی ہے کہ موصوف کو راحت وسکون جلد نصیب ہو، اور وہ چیز جس سے ان کو خوشی ہو، آپ بھی یہی دعا فرمائیں، آپ کو سلام لکھواتے ہیں، اور خاتمہ بالخیر کی درخواست اور آپ کے لیے بے حد دعائیں فرماتے ہیں۔ عزیزم محمد سلمہ سلام عرض کرتے ہیں۔

والسلام

آپ کا محمد یوسف بنوری عفی عنہ

حضرت علامہ محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ بنام حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۵ھ

مخدومِ گرامی مفاخر زادکم اللہ توفیقًا إلیٰ کل خیر، في عافیةٍ و صحةٍ و قوةٍ، آمین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نامۂ برکت نے عزت افزائی فرمائی، مقدمہ جیسا کچھ بنا آپ کی خوشنودی کے لیے تحریر کیا گیا، اور ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کی خوشنودی حق تعالیٰ کی خوشنودی کا ذریعہ بنے گی، مقدمہ نہ صرف ارتجال واستعجال میں لکھا گیا ہے، بلکہ طبیعت کی انتہائی غیر حاضری میں لکھا گیا ہے، اور آج کل تو میں اکثر اسی غیر حاضری میں مبتلا رہتا ہوں، تمہید میں عرب علماء وناظرین کی رعایت کی گئی ہے، اس لیے قدرے طویل ہوگئی۔

علاوہ بقیہ تشویشناک امور کے حضرت قبلہ والد صاحب کی علالت نہیں، بلکہ حالت ایسے مرحلہ میں داخل ہوگئی ہے کہ پریشانی ہوتی ہے، فرماتے تھے: ''جانے کے دن بہت قریب ہیں، لیکن تاخیر ہورہی ہے اور اس تاخیر میں اسرار ہیں۔'' دماغ حاضر ہے، البتہ اکثر غنودگی طاری رہتی ہے، آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔

آپ کی کمزوری سے صدمہ ہے، آپریشن کے بعد سنا ہے کہ بے حد کمزوری ہوجاتی ہے، سابقہ

آپریشن کے عہد میں ضعفِ طبعی اتنا نہ تھا، اس لیے اس کا زیادہ احساس نہیں ہوا، عزیزم محمد سلمہ کی خواہش ہے کہ اس ضعف کے رفع کرنے کے لیے کوئی خمیرہ مروارید عنبری یا خمیرہ ابریشم ارشد والا اگر کوئی آنے والا مل جائے تو ارسال کرے۔ حاجی بشیر صاحب بہت بہتر ذریعہ تھے، لیکن اُس وقت اس کا احساس نہیں ہوسکا۔

میری زندگی بہت ضائع گزر رہی ہے، اس کے لیے خصوصی دعاؤں کی ضرورت ہے، روضۂ اقدس پر ابلاغِ سلام کی سعادت سے محروم نہ فرمائیں۔ اگرچہ عرضِ سلام سے شرمساری ہے، ''تو بیرونِ دَر چہ کردی؟!''(۱) والا معاملہ ہے، اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں۔

سننے میں آیا ہے کہ آپ پھر ماہِ رمضان مبارک احباب کی خاطر سہارن پور میں گزارنے کا ارادہ فرمارہے ہیں، اگر کوئی غیبی اشارہ ہو تو ہمیں اس میں دخل کی ضرورت نہیں، ورنہ آپ کی صحت کے پیشِ نظر یہ پسند نہیں۔

والسلام

محمد یوسف بنوری عفی عنہ

.....❁.....❁.....❁.....

(۱) فارسی کے درج ذیل شعر کی جانب اشارہ ہے:

به طوافِ کعبه رفتم به حرم اهم نه دادند
تو بیرونِ دَر چه کردی که درونِ خانه آئی؟!

وفاق المدارس اور سیاست

مفتی رفیق احمد بالاکوٹی
استاذ ونگران شعبہ تخصصِ فقہِ اسلامی، جامعہ

چند ابہامات!

رمضان المبارک کے اواخر سے شوال المکرم کے اوائل تک ذرائع ابلاغ سے لاتعلق رہا، اس عرصے میں رونما ہونے والے حوادث وواقعات کی تفصیلات سے بھی بے خبر رہا، اسی بے خبری کے دوران اتحادِ تنظیماتِ مدارسِ دینیہ کے ایک کرم فرما بزرگ نے بذریعہ فون مبارک باد دینا چاہی کہ آپ کو نئے بورڈ مبارک ہوں! بندہ نے اپنی لاعلمی چھپانے کے لیے بزرگ موصوف کے ساتھ ظریفانہ تعلق میں بات ٹالنے کی یوں کوشش کی کہ: ''حضرت! فقہاء نے ''باب ثبوت النسب'' میں لکھا ہے کہ جس نومولود (نکے) کا ابا مشکوک، یا نامعلوم ہونے کی بدگمانی ہو، اس کی مبارک باد وصول کرنا جائز معروف رشتے کی غیرت کے خلاف ہوتا ہے۔'' وہ بزرگ خوب محظوظ ہوئے، اور بات آئی گئی ہوگئی۔

کراچی پہنچنے پر تفصیلات کا علم ہوا کہ بزرگ موصوف کا اشارہ ہمارے مسلک کے اُن نئے بورڈز کے قیام کی طرف ہے:

۱:- جو وفاق المدارس سے الگ ہوکر نئے بورڈز کے طور پر متعارف ہوئے ہیں۔

۲:- یا ایسے مدرسوں پر مشتمل ہیں جو وفاق جیسے کسی بورڈ سے منسلک ہی نہیں تھے، اُنھیں نیا بورڈ نصیب ہوا ہے۔

۳:- یا بعض ایسے خوش نصیب بھی ہیں جن کے مدارس کا فی الحال وجود ہی نہیں ہے، آگے چل کر اُنھیں مدارس مہیا ہوں گے، یا بغیر طلباء کے چلنے والے بعض مدارس کی طرح، بغیر مدارس کے چلنے والے بورڈز کی طرح وہ بورڈز اپنی خدمات سرانجام دیتے رہیں گے۔

ان نئے بورڈز کے بارے میں مثبت ومنفی ہر قسم کے تبصروں کا بازار گرم ہے، شاید ہی کوئی ایسا پہلو بچتا ہو جس پر تبصرہ نہ ہوا، تبصرے کی اس گرم بازاری میں علماء وطلباء یکساں شریک ہیں، مگر دوسری طرف ہمارے دینی مدارس کے تعلیمی سال کا آغاز ہو چکا ہے، اس لیے میں اپنے طلباء ساتھیوں سے دینی خیر خواہی کے تحت یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ وہ نئے اور پرانے بورڈز سے متعلق تبصروں سے گریز کریں اور اپنی تعلیم پر توجہ دیں، یہ جتنے بورڈز تا حال وجود میں آئے ہیں، یہ ہمارا امتحان لینے کی حرص پر مبنی ہیں، اس مبصرانہ امتحان میں پڑے رہنے کی بجائے اپنی تعلیم پر توجہ دیں، تاکہ آنے والے امتحان میں سرخرو ہوا جا سکے۔

طالب علم کا کام تعلیم اور امتحان کی تیاری سے ہونا چاہیے، نہ کہ امتحانی بورڈز پر تبصروں سے، ہاں! طالب علم یہ ضرور سوچے کہ کس بورڈ میں کیا پڑھایا جا رہا ہے؟! اور یہ سوچ ہر بورڈ کے ذمہ داروں کی بھی ہونی چاہیے، بالخصوص وہ بورڈز جو خالص دینی تعلیم کے نام پر مسلمانوں سے تبرُّعات، صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ وصول کرتے ہیں، کیوں کہ ہمارے مسلمان ہمارے دینی اداروں میں خالص دینی تعلیم کی حفاظت واشاعت کے لیے جو مال جمع کراتے ہیں، اس مال کے ذریعہ وہ اپنی آخرت سنوارنے کا عقیدہ ونیت رکھتے ہیں، ان کی اس نیت کا لحاظ رکھنا شرعاً اہلِ مدارس پر لازم ہے، ورنہ اہلِ مدارس امین کی بجائے خائن کہلائیں گے اور دینی مدارس کی وضعی ساخت کے منافی اِقدام کے مرتکب ٹھہریں گے۔

دوسرا یہ کہ کسی کام کے ہو چکنے کے بعد اس کے ہونے یا نہ ہونے کے تبصروں کے بجائے اس کام کو اس کے منطقی انجام کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ماضی کی تاریخ گواہ ہے کہ دینی مدارس کے وجود، نظام، نصاب اور وحدت کو نقصان پہنچانے کے لیے جو بورڈز اور ادارے قائم ہوئے تھے، وہ اپنے قائم کنندگان کے اقتدار یا کرم فرماؤں کی سروس ختم ہوتے ہی ختم ہو گئے تھے۔ وفاق المدارس کے لاہور کے اجتماع میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم کا نقل فرمودہ امام مالکؒ کا قول بھی سامنے رہنا چاہیے کہ: ''ماکان للہ یبقی وماکان لغیر اللہ ینفی.''

سو دینی طلباء کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ اسلامیہ کالج پشاور، جامعہ اسلامیہ اسلام آباد اور جامعہ اسلامیہ بہاول پور کی دینی وعصری علوم کی امتزاجی وحدت سے روایتی دینی مدارس کے وجود اور رجحان میں کوئی منفی اثر نہیں پڑا۔

ہمارے طلباء کو یہ بھی اطمینان رکھنا چاہیے کہ ہمارے جو مقتدر ادارے وفاق سے الگ ہوئے ہیں، وہ پہلے سے عملی وفکری طور پر انفرادیت وعلیحدگی میں معروف تھے، ان کی علیحدگی کو وفاق سے

علیحدگی کہنے کی بجائے اپنی قرارگاہ میں اعلانیہ واپسی سے تعبیر کرنا زیادہ واضح ہے۔ یہ اقدام ایسے مدارس کے حق میں بھی مفید معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ وہ وفاقی بندھن کی وجہ سے قسما قسم کی اجتماعی واخلاقی پابندیوں سے آزاد ہوگئے: ''قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ''، لہٰذا طلباء کرام کو چاہیے کہ وہ اس قسم کی اَبحاث واِبہامات سے لاتعلق ہوکر اپنی تعلیم پر توجہ دیں اور کسی بحث کا حصہ نہ بنیں۔

الحمدللہ وفاق المدارس کی ہر پالیسی واضح، روشن اور غیر مبہم ہوتی ہے، اس بارے میں وفاق المدارس سے وابستہ اہلِ علم یا باخبر طبقے کو کسی قسم کی تشویش کا موقع بالعموم نہیں ملتا، اگر وفاق المدارس کی تاریخ، روایت اور دستور سے مناسبت کی کمی کا شکار حضرات کو جس قسم کے اِبہامات یا تشویشات کا سامنا ہوسکتا ہے، ان کا اِزالہ یا سدِباب کرنا ہم طلباء کی ضرورت اور اکابر کی ذمہ داری ہے۔

من جملہ حال یا ماضی میں اکابرِ وفاق کی یہ وضاحتیں یا اعلانات کہ وفاق غیر سیاسی ادارہ ہے، اس کا سیاست کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور ہم وفاق میں سیاست کا راستہ روکیں گے یا وفاق کو سیاست سے پاک رکھنے میں کردار ادا کریں گے، یہ باتیں بظاہر دستورِ وفاق اور نفس الامر کے عین مطابق ہیں، کیوں کہ وفاق المدارس دینی مدارس کے نصابی، انتظامی اور امتحانی نظم کے قیام کا ادارہ ہے، یہ کام نہ تو کوئی سیاسی جماعت کرتی ہے، نہ اس کی ضرورت ہے اور اگر ان ذمہ داریوں کا حامل بورڈ سیاسی عمل میں شریک ہوتو یقیناً بورڈ کے وضعی مقاصد میں نہ صرف یہ کہ خلل آئے گا، بلکہ بالصراحۃ مطلوبہ مقاصد فوت بھی ہوجائیں گے۔

البتہ اس نفس الامری حقیقت کا ایک عرصے سے مخصوص انداز میں مخصوص افراد سے انتہائی معنی خیزی میں اظہار ہورہا ہے، جس سے وفاق المدارس کی غیر سیاسی حیثیت کی واضح حقیقت' کسی خطرناک اِبہام کا شکار ہوتی جارہی ہے، اس لیے اس اِبہام کی وضاحت کے لیے اکابر سے درخواست ہے کہ وفاق کو ''سیاست'' سے دور رکھنے کا مطلب واضح فرمائیں۔

اس اِبہام کا ایک پہلو یہ ہے کہ وفاق المدارس ایک امتحانی بورڈ ہے، وفاق کی کارکردگی اپنی ساخت، شناخت اور مقصدیت تک محدود رہے، وفاق کے عہدیداران نہ تو کوئی سیاسی مؤقف قائم کریں، نہ اس پر رائے دیں، اور نہ ہی وفاق المدارس کو سیاسی تنظیموں کے طرز پر گلی، کوچوں، بازاروں اور چوراہوں میں گھمائیں، وفاق کو سیاسی تنظیم، اور خود کو اس تنظیم کے قائدین بننے، کہلانے اور مشتہر کرنے کا تأثر نہ دیں۔ اگر وفاق کے سیاست سے دور ہونے کا یہ مطلب ہوتو یہ دستور کے عین مطابق ہے، اس پر کسی کو اشکال نہیں ہونا چاہیے، بلاشبہ وفاق المدارس کے مرکز، صوبوں اور ڈویژنوں

تک جو ذمہ داران اس روش کے حامل ہیں وہ وفاق کے دستور سے انحراف کا شکار کہلائیں گے، جو اکابر اس روش پر ہمیں متنبہ فرمارہے ہیں ہمیں ان کی تنبیہ کا پاس رکھنا چاہیے، یہ وفاق کی وفاقیت ووحدت کے لیے لازمی امر ہے۔

''وفاق اور سیاست'' کی بابت ایک اِبہام یہ بھی ہے کہ وفاق سے وابستہ افراد کسی سیاسی جماعت بالخصوص حکمران جماعت سے ووٹر، سپورٹر یا ہمدردی کا تعلق نہ رکھیں، یہ بات بھی حکمران جماعت کی حد تک اس لیے درست ہوسکتی ہے کہ سنجیدہ، متدین، عاقبت اندیش اور واقفانِ حال خوب جانتے ہیں کہ حکمران جماعت کے بارے میں انھیں یہودی نمائندگی اور قادیانیت نوازی کے اِبہامات وشبہات ہیں، اس لیے وفاق سے وابستہ جو حضرات سیاسی جماعتوں میں سے کسی بھی جماعت بالخصوص حکمران جماعت کی ہمدردی یا پسندیدگی کا دم بھرتے ہوں، یقیناً ایسا عمل وفاق المدارس کے دینی وروحانی عمل کے منافی ہے، ایسے سیاسی خیالات کے حامل حضرات سے وفاق کی حفاظت یقیناً اربابِ وفاق کی ذمہ داری ہے، وفاق المدارس کے ذمہ داران کی طرف سے ایسے بیانات کا خیر مقدم ایمانی تقاضا ہے۔

''وفاق المدارس اور سیاست'' کے حوالے سے ایک معنی خیز بلکہ خطرناک پہلو یہ سوچا، سمجھا اور باور کرایا جارہا ہے کہ وفاق المدارس اور مسلکِ دیوبند کی دینی سیاسی جماعت ''جمعیت علمائے اسلام'' اور اس کے عہدیداران کا وفاق المدارس سے تعلق باعثِ تشویش ہے، یہ تشویش واقعی بڑی تشویش ہے، اور کئی اعتبارات سے وفاق کے وجود کے خاتمے کا باعث ہے۔

اگر وفاق اور سیاست سے متعلق بیانات کا یہ مطلب لیا جائے کہ جمعیت علمائے اسلام بحیثیت جماعت وفاق المدارس کو جمعیت طلبائے اسلام کی طرح اپنی ذیلی تنظیم بنانے جارہی ہے تو بیان کردہ تشویش اپنے ظاہر کی حد تک بالکل بجا ہے، ایسا اقدام وفاق کے دستور بلکہ وجود کے بھی منافی ہے۔ لیکن ہمارے علم کے مطابق جمعیت علمائے اسلام کا ایسا کوئی نامناسب عزم سامنے نہیں آیا۔

ہاں! اگر وفاق اور سیاست کا یہ مطلب لیا جارہا ہو کہ جمعیت کا کوئی عہدیدار وفاق کے کسی عہدے پر فائز نہیں ہوسکتا، باوجود یہ کہ وہ وفاق سے منسلکہ کسی ادارے کا ذمہ دار ہو تو یہ سوچ وفاق المدارس کی ماضی وحال کی تاریخ کا منہ چڑاتی ہے، کیونکہ وفاق کے پہلے ناظم اعلیٰ بلکہ بانی رکن حضرت مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ، جامعہ قاسم العلوم ملتان کے مہتمم اور حضرت لاہوریؒ کے نائب ہونے کے ناطے وفاق کی نظامتِ علیا پر فائز تھے، اس وقت سے تاحال جمعیت علمائے اسلام کے کئی عہدیدار، سینیٹرز، ممبرانِ قومی

اسمبلی اور صوبائی اسمبلی، وفاق المدارس کی مرکزی وصوبائی باڈی کا حصہ ہیں اور جماعتی وابستگی سے بالاتر ہوکر وفاق کی خدمت میں دیگر ذمہ داران سے بڑھ کر حصہ لے رہے ہیں، آج تک اُن پر کسی نے اشکال نہیں کیا۔

ایسی نفس الامری حقیقت کا مطالعہ ومشاہدہ ہونے کے باوجود اگر کوئی وفاق المدارس سے سیاست کی تطہیر کا دعویدار یا علمبردار ہوتو اُن کی یہ سوچ یا تو اس عنادِ محض پر مبنی ہے جو مفتی محمودؒ کی ذات وشخصیت کے بارے میں بعض حضرات کو لاحق تھا، جس کی پاداش میں وہ وفاق سے دوری کو سیاست سے اجتناب کہا کرتے تھے یا اس کا دوسرا منفی مقصد یہ ہے کہ یہ زبان وبیان وفاق کی وفاقیت کی غرض کے بجائے جمعیت علمائے اسلام کی سیاسی حریف جماعتوں کی ترجمانی اور وفاداری ہوسکتی ہے۔

اسی طرح وفاق اور سیاست کا اگر یہ مطلب لیا اور باور کرایا جارہا ہو کہ وفاق المدارس میں صرف وہی مدارس ہوسکتے ہیں جن کے سربراہان اور طلباء کا جمعیت علمائے اسلام یا کسی بھی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا، باوجودیکہ وہ سیاسی وابستگی کے باوصف وفاق کے دستور کے مطابق وفاق کی بالادستی پر یقین رکھتے ہوں تو یہ خیال پہلے تمام خیالات کے مقابلے میں زیادہ بھیانک ہوگا، کیوں کہ وفاق المدارس سے منسلک مدارس میں سے شاید ہی کوئی ایسا مدرسہ ہوجس کے اساتذہ اور طلباء میں سے کوئی جمعیت علمائے اسلام سے نظریاتی وابستگی نہ رکھتا ہو۔

وفاق المدارس العربیہ سے وابستہ افراد میں سے کسی کا کوئی اس طرح کا بیان سامنے آتا ہے تو اس کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱:- یا تو وہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کو بھی غیر اعلانیہ ''مجمع'' کی طرح کا وفاق بنانے کا عزم رکھتے ہیں۔

۲:- یا پھر وفاق المدارس سے جمعیت علمائے اسلام کے دینی وسیاسی نظریات کے حاملین کو باہر کرکے وفاق المدارس کو نئے بورڈ کی طرح ایسا بورڈ بنانا چاہتے ہیں جو حکومت کا تابع مہمل بن کر رہ جائے۔

اگر ''وفاق اور سیاست'' جیسے بیانات کے پیچھے اس قسم کی غرضِ فاسد کارفرما ہوتو وفاق المدارس سے وابستہ احباب کو اطمینانِ تام اور یقین کامل رکھنا چاہیے کہ یہ سوچ ہمیشہ کی طرح خاک آلود ہوگی اور وفاق المدارس کی وحدت ووِفاقیت کو ایسی سوچوں سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، ان شاء اللہ!

اللہ تعالیٰ ہم سب کو وفاق المدارس کی وفاقیت کے تحفظ کے لیے استعمال فرمائے، آمین۔

تعویذ کی حقیقت اور اُس کا شرعی حکم

مفتی شفیق الدین الصلاح
تیمر گرہ، لوئر دیر

بعض مرتبہ یہ سوال اُٹھتا ہے کہ تعویذ کا کیا حکم ہے؟ اور دم وتعویذ میں کیا فرق ہے؟ سو یاد رکھئے کہ ان میں وہی فرق ہے جو کلامِ الٰہی اور کتاب اللہ میں ہے۔ کتاب اللہ کو لکھا جاتا ہے اور کلام اللہ کو پڑھا جاتا ہے۔ جس طرح ہم کلام اللہ کی عزت کرتے ہیں، ناپاک ہونے کی حالت میں اُسے اپنی زبان پر نہیں لاتے، قرآن کریم کتاب کی صورت میں ہے تو اُسے چھو بھی نہیں سکتے۔ اگر یہ لکھا ہوا قرآن واجب الاحترام نہ ہوتا، تو آنحضرت ﷺ یہ نہ فرماتے کہ جب دشمن کے علاقے میں جاؤ تو لکھا ہوا قرآن (مصحف) وہاں نہ لے جاؤ، کہیں دشمن کے ہاتھ لگے اور وہ اس کی بے احترامی کریں۔

علاج بالقرآن دم سے ہوسکتا ہے تو لکھے ہوئے پاک اور طیب کلمات سے کیوں نہیں ہوسکتا؟! وہاں بھی اس میں تاثیر اذنِ الٰہی سے آتی ہے، اور تعویذ میں بھی حروف وکلمات مؤثر بالذات نہیں، اثر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے، جب وہ چاہے۔ رہا پاک کلمات کو حروف میں لکھنا تو اس میں ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ان کلمات اور آیات پر دلالتِ لفظی ہو تو یہ وہ صورت ہے جو ہمیں عیاناً (کھلی ہوئی) نظر آتی ہے اور دلالتِ وضعی ہو تو یہ ان کلمات کے حروفِ ابجد ہیں اور ان میں بھی اثر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی آتا ہے، یہ حروف بالذات کوئی اثر نہیں رکھتے۔

تعویذ میں روحانی اثرات

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: جو شخص اپنی نیند میں گھبرا جائے اُسے چاہیے کہ وہ یہ کلمات پڑھے: ''اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ مِنْ غَضَبِهٖ وَعِقَابِهٖ وَشَرِّ عِبَادِهٖ وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَاَنْ يَّحْضُرُوْنَ.'' تو وہ خواب اُسے ہرگز نقصان نہ دے گا، آپؓ کے پوتے کہتے ہیں کہ: حضرت عبداللہؓ کی اولاد میں جو بالغ ہوجاتا تو آپ اُسے یہ کلمات سکھا دیتے،

اور جو نابالغ ہوتا تو آپ اس کے گلے میں یہ دعا لٹکا دیتے تھے:

''و كان عبد الله بن عمروؓ يعلمها من بلغ من ولدهٖ و من لم يبلغ منهم كتبها في صك ، ثم علقها في عنقهٖ . ''

(رواہ ابوداؤد والترمذی، بحوالہ مشکوٰۃ، ص: ۲۱۷)

اس سے معلوم ہوا کہ کلام پاک کا پڑھنا اور کلماتِ مبارکہ تعویذ لکھ کر بنانا اور اُسے بدن سے باندھنا دونوں عمل جائز ہیں۔ اگر یہ عمل ناجائز ہوتا تو آنحضرت ﷺ کے جلیل القدر صحابیؓ کبھی بھی اپنے بچوں کے گلے میں تعویذ نہ ڈالتے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے اس عمل سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ تعویذات کے اثر کے قائل تھے، جبھی تو آپ نے تعویذ لکھا اور اسے اپنے بچوں کے گلے میں ڈالا۔ یہ کلمات کوئی روحانی تاثیر نہ دیتے تو آپ ہی بتلائیں کیا صحابی رسول ایسا عمل کرتے؟

تاثیر میں اذنِ الٰہی کو شرط جاننا ضروری ہے

۱: دسویں صدی کے مجدد حضرت ملا علی قاریؒ (متوفی: ۱۰۱۴ھ) اس حدیث پر لکھتے ہیں کہ:

''و هٰذا أصل في تعليق التعو يذات التي فيها أسماء الله تعالٰى.'' (مرقات، ج:۵، ص:۲۳۶)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ تعویذات جو اسمائے الٰہیہ اور کلماتِ مبارکہ پر مشتمل ہوں، اپنے اندر ایک روحانی اثر رکھتے ہیں اور اس سے مریضوں کا علاج کرنا علاج بالقرآن ہی ہے۔ ہاں! وہ تعویذات جو شرکیہ الفاظ پر مشتمل ہوں، ان کی قطعاً اجازت نہیں۔ جن روایات میں تمائم اور رُقٰی کو شرک کہا گیا ہے، اس سے مراد اسی قسم کے دم اور تعویذ ہیں، جن میں شرکیہ الفاظ و اعمال کا دخل پایا جائے۔ ''التمائم'' میں ''الف لام'' اسی کے لیے ہے، اور جو دم اور تعویذ اس سے خالی ہوں، ان کا استعمال جائز ہے اور اس کے روحانی اثرات ثابت ہیں۔ حضرت عوف بن مالکؓ کہتے ہیں کہ ہم دورِ جاہلیت میں دم کیا کرتے تھے، ہم نے آنحضرت ﷺ سے اس بابت پوچھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''أعرضوا عَلَيَّ رقاكم ، لا بأس بالرقى ما لم يكن فيه شرك.'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ، ص:۳۸۸)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ دم اور تعویذ میں اصل وجہِ منع کفر و شرک ہے، جب یہ نہ ہو تو وہ دم اور تعویذ جائز ہے، چنانچہ ابن تیمیہؒ اپنی کتاب ''مجموعة الفتاوىٰ'' میں تعویذ کے جواز پر ایک مستقل فصل ''فصل : في جواز أن يكتب لمصاب و غيره ... الخ'' باندھ کر اس کے تحت لکھتے ہیں:

''و يجوز أن يكتب للمصاب و غيره من المرضٰى شيئًا من كتاب الله و ذكره بالمداد المباح ، و يغسل و يسقٰى ، كما نص علٰى ذلك أحمد و غيره.''

(مجموعۃ الفتاویٰ، ج:۱۹، ص:۳۶، ط: مکتبۃ العبیکان)

کسی مریض کے لیے کتاب اللہ میں کچھ لکھ کر دینا یا اس کو دھو کر پانی میں گھول کر پلانا، یہ

دونوں جائز ہیں۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ ''کفایت المفتی'' میں رقم طراز ہیں کہ:

''قرآن شریف کی آیت تعویذ میں لکھنا جائز ہے۔''

(کفایت المفتی، الحظر والاباحۃ، الفصل الثانی فیما یتعلق بالعوذۃ، ج:۱۲، ص:۴۸۲، ط: فاروقیہ)

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اپنی کتاب ''تکملة فتح الملهم'' میں لکھتے ہیں کہ:

'' ..... فتبين بهٰذا أن التمائم المحرمة لا علاقة لها بالتعاويذ المكتوبة المشتملة علىٰ أيات من القرآن أو شيء من الذكر ؛ فإنها مباحة عند جماهير فقهاء الأمة ، بل استحبها بعض العلماء إذا كانت بأذكار مأثورة ، كما نقل عنهم الشوكاني في النيل ، والله أعلم.''

(تکملہ فتح الملہم، کتاب الطب، باب رقیۃ المریض، کتابۃ التعویذات، ج:۴، ص:۳۱۸، ط: دار العلوم، کراچی)

وہ تعویذات جن میں اللہ کے کلام اور مسنون دعاؤں کا ذکر ہو تو وہ قطعاً حرام نہیں، ان کا حرمت سے کوئی تعلق نہیں، ایسے تعویذات تو عام جمہور علماء کے نزدیک جائز ہیں، بلکہ بعض علماء نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے، علامہ شوکانیؒ نے ان سے یہ ''نیل الأوطار'' میں نقل بھی کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ ''فتح الباري'' میں لکھتے ہیں کہ:

''أجمع العلماء علىٰ جواز الرقىٰ عند اجتماع ثلاثة شروط: أن يكون بكلام الله أو بأسمائه و صفاته و باللسان العربي أو بما يعرف معناه من غيره و أن يعتقد أن الرقية لا تؤثر بذاتها بل بذات الله تعالىٰ .''(فتح الباری، ج:۱۰، ص:۱۹۵، ط: دار الفکر بیروت)

''علماء نے دم اور تعویذ کے جواز پر اجماع کیا ہے، جب ان میں درج ذیل شرائط پائی جائیں:

❶:- وہ اللہ کے کلام، اسماء یا اس کی صفات پر مشتمل ہوں۔

❷:- وہ عربی زبان یا پھر ایسی زبان میں ہوں جس کا معنی سمجھ میں آتا ہو۔

❸:- یہ یقین رکھنا کہ اس میں بذاتِ خود کوئی اثر نہیں، بلکہ مؤثر حقیقی اللہ جل شانہ کی ذات ہے۔

علامہ شامیؒ بھی اپنی کتاب ''رد المحتار'' میں تعویذ کا جواز نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

'' و إنما تكره العوذة اذا كانت بغير لسان العرب و لا يدرى ما هو ، ولعله يدخله سحر أو كفر أو غير ذلك و أما ما كان من القرآن أو شيء من الدعوات، فلا بأس به.'' (ردالمحتار، ج:۶، ص:۳۶۳)

''فتاویٰ ہندیہ'' میں ہے کہ:

'' و اختلف في الاسترقاء بالقرآن نحو : .....أن يكتب في ورق و يعلق أو يكتب في طست ،فيغسل و يسقىٰ المريض ،فأباحه عطاء و مجاهد و

أبو قلابة و كرهه النخعي و البصري ،كذا في '' خزانة الفتاوىٰ'' قد ثبت ذلك في المشاهير من غير إنكار .....و لابأس بتعليق التعويذ ..الخ.'' (الفتاوى الهندية، الباب الثامن عشر في التداوي، ج:۵،ص:۳۵۶، ط: دار الفكر)

''قرآنی آیات کے ذریعہ دم میں علماء نے اختلاف کیا ہے، مثلاً:.....کسی کاغذ پر قرآن کی آیت لکھ کر مریض کے جسم پر باندھ لیا جائے، یا کسی برتن میں آیات لکھ کر دھو یا جائے اور مریض کو پلایا جائے، تو عطاءؒ، مجاہدؒ اور ابو قلابہؒ اس کو جائز سمجھتے ہیں اور امام نخعیؒ اور بصریؒ اس کو مکروہ سمجھتے ہیں، لیکن مشہور کتابوں میں اس کے جواز پر کوئی نکیر وارد نہیں ہوئی ہے.....آگے لکھتے ہیں کہ تعویذ کے لٹکانے میں کوئی حرج نہیں۔''

ابن القیم الجوزیہؒ اپنی کتاب ''زاد المعاد'' میں لکھتے ہیں:

'' قال المروزي : و قرأ علىٰ أبي عبد الله وأنا أسمع أبو المنذر عمرو بن مجمع ، حدثنا يونس بن حبان ، قال : سألت أبا جعفر محمد بن علي أن أعلق التعويذ ، فقال : إن كان من كتاب الله أو من كلام عن نبي الله فعلقه و استشف به ما استطعت.'' (زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، کتاب عسر الولادۃ، ج:۴،ص:۳۳۷، ط: مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت۔ کذا فی الطب النبوی لابن القیم الجوزیۃ، حرف الکاف، ج:۱،ص:۳۷۰، ط: دار الہلال، بیروت)

''راوی کہتا ہے کہ میں نے ابوجعفر محمد بن علی سے تعویذ باندھنے کے بارے میں دریافت کیا کہ اس کا کیا حکم ہے؟ تو آپ نے فرمایا: کہ اگر وہ اللہ اور نبی ﷺ کے کلام پر مشتمل ہو تو اس کو باندھ لیا کرو، اس میں کوئی حرج نہیں۔''

تفسیر ''روح البیان'' میں ہے کہ:

'' وأما تعليق التعويذ و هو الدعاء المجرب أو الآية المجربة أو بعض أسماء الله تعالىٰ لدفع البلاء ، فلا بأس به و لكن ينزعه عند الخلاء و الجماع.''

(روح البیان، سورۃ یوسف، آیۃ:۶۸، ج:۴،ص:۲۹۵، ط: دار الفکر، بیروت)

''تعویذ اگر مجرب دعا، مجرب آیت یا اللہ کے اسماء پر مشتمل ہو، اور کسی مصیبت یا بیماری کے دفعیہ کے غرض سے لٹکایا ہو تو یہ جائز ہے، لیکن جماع اور بیت الخلاء جانے کے وقت نکالے گا۔''

''تفسیر قرطبی'' میں ہے کہ:

''و سئل ابن المسيب عن التعويذ أيعلق ؟ قال : إذا كان في قصبة أو رقعة يحرز، فلابأس به . و هٰذا علىٰ أن المكتوب قرآن . وعن الضحاك أنه لم يكن يرى بأسا أن يعلق الرجل الشيء من كتاب الله إذا و ضعه عند الجماع و عند

الغائط ، و رخص أبو جعفر محمد بن علي في التعو يذ يعلق على الصبيان ، وكان ابن سيرين لا يرى بأسا بالشيء من القرآن يعلقه الإنسان. ''

(تفسیر قرطبی، سورۃ الاسراء: ۸۲، ج: ۱۰، ص: ۳۲۰، ط: دار المعرفۃ)

سعید ابن المسیبؒ، ضحاک اور ابن سیرین جیسے اکابر علماء اس کے جواز کے قائل تھے۔

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ لکھتے ہیں کہ:

''..... قرآنی آیات کا تعویذ جائز ہے، جبکہ غلط مقاصد کے لیے نہ کیا گیا ہو، حدیث میں جن ٹونوں، ٹوٹکوں کو شرک فرمایا گیا ہے، ان سے زمانۂ جاہلیت میں رائج شدہ ٹونے اور ٹوٹکے مراد ہیں، جن میں مشرکانہ الفاظ پائے جاتے تھے، اور جنات وغیرہ سے استعانت حاصل کی جاتی تھی، قرآنی آیات پڑھ کر دم کرنا آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے اور بزرگانِ دین کے معمولات میں شامل ہے۔''

(آپ کے مسائل اور ان کا حل، تعویذ گنڈے اور جادو، ج: ۲، ص: ۴۹۹، ط: مکتبہ لدھیانوی)

علامہ شوکانیؒ ابن ارسلانؒ سے نقل کرتے ہیں کہ:

'' قال ابن أرسلان ،فالظاهر أن هٰذا جائز لا أعرف الاٰن ما يمنعه في الشرع. '' (فتاویٰ اہل حدیث، ج: ۱، ص: ۱۹۳)

''ابن ارسلان کہتے ہیں کہ ظاہر یہی ہے کہ یہ جائز ہیں، شریعت میں اس کے منع کی کوئی دلیل میں نہیں جانتا۔''

شفاء بنت عبداللہ سے روایت ہے کہ میں ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس بیٹھی تھی کہ آنحضرت ﷺ تشریف لائے، آپ نے مجھے کہا:

''ألا تعلمين هٰذه رقية النملة كما علمتها الكتابة. '' (مسند احمد ج: ۱۷، ص: ۱۷۹، مبوب)

''اے شفاء! کیا تو انھیں (یعنی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو) نملہ کا دم نہیں سکھا دیتی، جیسا کہ تو نے انھیں لکھنا سکھا دیا ہے؟۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ دم اور تعویذ جس میں کفر وشرک اور غیر معروف الفاظ نہ ہوں اور الفاظ میں ذاتی تاثیر نہ سمجھی جائے، اس کے منع پر کوئی دلیل وارد نہیں۔ شیخ احمد عبدالرحمٰن البناؒ لکھتے ہیں کہ یہ ہرگز ممنوع نہیں، بلکہ سنت ہے:

'' فلا نهيَ فيه ، بل هو السنة . '' (ایضاً ص: ۱۷۷)

نواب صدیق حسن خانؒ نے ''الدین الخالص'' میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے، اور انہوں

نے بھی دم اور تعویذ کو جائز قرار دیا ہے، البتہ ان سے پرہیز کرنے کو افضل کہتے ہیں اور یہ اپنے آپ کو ابرار میں لانا ہے جو اسباب اختیار نہیں کرتے۔ حافظ عبد اللہ روپڑی صاحبؒ نواب صاحبؒ کی یہ عبارت پیش کر کے لکھتے ہیں:

''اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ صرف شرک والی صورتیں منع ہیں، باقی جائز ہیں۔ ہاں! پرہیز بہتر ہے۔'' (فتاویٰ اہل حدیث، ج:۱،ص:۱۹۳)

حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''راجح یہ ہے کہ آیات یا کلماتِ صحیحہ دعائیہ جو ثابت ہوں، ان کا تعویذ بنانا جائز ہے، ہندو ہو یا مسلمان، صحابہ کرامؓ نے ایک کافر بیمار پر سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا تھا۔'' (فتاویٰ ثنائیہ، ج:۱،ص:۳۳۹)

اہلِ حدیث کے ایک مشہور عالم مولانا شرف الدین دہلویؒ اس کی تائید میں لکھتے ہیں کہ:

''حضرت عبد اللہ ابن عمرو بن العاصؓ صحابی ''أعوذ بكلمات الله .... الخ'' ساری دعا لکھ کر اپنے بچوں کے گلے میں لٹکایا کرتے تھے۔'' (ایضا)

غرض یہ کہ مذکورہ بالا دلائل وحوالہ جات سے یہ بات واضح اور عیاں ہوگئی کہ علاج بالقرآن کی ایک قسم تعویذ بھی ہے، اور اس کے روحانی اثرات کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سے مریض تعویذوں میں لکھی گئی آیاتِ قرآنیہ اور کلماتِ دعائیہ کی برکت سے کئی لاعلاج امراض سے بھی نجات پا گئے ہیں۔ ہاں! ان میں تاثیر ان کلمات کی ذات سے نہیں، بلکہ اللہ رب العزت کے حکم ہی سے آتی ہے۔

اگر ان تعویذات اور دموں میں کوئی روحانی تاثیر نہ ہوتی، اور اس کا باطنی فائدہ نہ ہوتا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سونے سے پہلے قرآن کی آخری تین سورتیں پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونک نہ مارتے اور انھیں اپنے بدن پر نہ ملتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ عمل تین مرتبہ فرماتے، حتیٰ کہ مرض الوفات میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود کمزوری کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انہی سورتوں کو پڑھا، اور آپ کے ہاتھوں پر پھونک لگائی اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں کو آپ کے بدن پر مل لیا۔ ایک مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دم کیا تھا۔ (رواہ مسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سورتوں کو پڑھ کر ہاتھوں پر دم کرنا اور پھر اپنے ہاتھوں سے پورے بدن کو ملنا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ ان آیات میں ضرور روحانی اثر ہے، اور یہ شیطانی اثرات سے بچانے کا ایک خاص عمل ہے، جو بظاہر نگاہوں سے مخفی ہوتا ہے، لیکن باطنی آنکھ والے ان کی تاثیرات کھلے طور پر دیکھتے ہیں، اور پڑھنے کے ساتھ ہاتھ پھیرنا یہ بھی ہرگز منع نہیں۔

یاد رہے کہ دم اور تعویذ میں وہی فرق ہے جو کلام میں اور کتاب میں ہے، دونوں کا اپنا اپنا

مقام ہے اور دونوں کا اپنا اپنا احترام ہے۔ لیکن تعویذ کے سلسلہ میں بعض فحش غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں، جس کی بیخ کنی نہایت اہم ہے اور اس سے قطعی پرہیز اور کنارہ کشی اختیار کرنا بہت ہی ضروری ہے:

❶:۔ بعض جاہلوں نے لکھا ہے کہ: مسلمان کی خیر خواہی کے لیے بوقتِ ضرورت شرکیہ الفاظ سے دم کرنا جائز ہے، سو یہ بالکل غلط ہے اور اس کا شریعت میں بالکل ثبوت نہیں۔

❷:۔ اکثر عوام عملیات (اور تعویذات وغیرہ) کو ایک ظاہری تدبیر سمجھ کر نہیں کرتے، بلکہ اس کو سماوی اور اور ملکوتی چیز سمجھ کر کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ تعویذ گنڈوں کے متعلق عوام کے عقائد نہایت برے ہیں، حالانکہ عملیات، تعویذ اور گنڈے وغیرہ بھی طبی دواؤں کی طرح ایک ظاہری سبب اور تدبیر ہے، (کوئی آسمانی اور ملکوتی چیز نہیں) بس جس طرح دواء سے کبھی فائدہ ہوتا ہے اور کبھی نہیں، اسی طرح تعویذ میں بھی کبھی فائدہ ہوتا اور کبھی نہیں، پھر بھی دونوں برابر نہیں، بلکہ دونوں میں یہ فرق ہے کہ عملیات میں فتنہ ہے اور دواء میں فتنہ نہیں، اور وہ فتنہ یہ ہے کہ کہ عامل کی طرف بزرگی کا خیال واعتقاد پیدا ہوتا ہے، طبیب کی طرف بزرگی کا خیال پیدا نہیں ہوتا۔

❸:۔ ایک اور بہت بڑی خرابی یہ ہے کہ اگر تعویذ گنڈے وغیرہ سے کام نہ ہوا، تو پھر آیاتِ الٰہیہ سے بدعقیدگی اور بدگمانی پیدا جاتی ہے۔

❹:۔ عملیات قریب قریب سب اجتہادی ہیں، روایات سے ثابت نہیں، جیسا کہ عوام کا خیال ہے کہ ان عملیات کو اوپر ہی سے اور حضور ﷺ سے ثابت سمجھتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ عاملین مضمون کی مناسبت سے ہر کام کے لیے مناسب آیات وغیرہ تجویز کرتے ہیں۔

❺:۔ آج کل لوگ اپنے مقاصد میں اور امراض ومصائب کے دفعیہ میں تعویذ گنڈوں کی تو بڑی قدر کرتے ہیں، اس کے لیے کوششیں بھی کرتے ہیں، اور جو اصل تدبیر ہے یعنی اللہ سے دعا، تو اس میں غفلت برتتے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ کوئی نقش وتعویذ دعا کے برابر مؤثر نہیں، بشرطیکہ تمام آداب و شرائط کی رعایت رکھی جائے۔

خلاصہ یہ کہ تعویذ بذاتہ جائز ہے، بشرطیکہ مذکورہ بالا شرائط کی رعایت رکھی جائے، اور درج بالا ناجائز اعتقادات سے خود کو پاک اور منزہ کیا جائے۔

نوٹ: اس مقالہ کا اکثر حصہ ڈاکٹر علامہ خالد محمود کی کتاب ''آثار القرآن'' اور حضرت تھانویؒ کی ''اغلاط العوام'' سے ماخوذ ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار مستند کتابوں سے بھی اخذ کیا گیا ہے۔

فتویٰ وقضاء میں فرق اور مسئلہ طلاق میں بے احتیاطی

مفتیانِ کرام کی خدمت میں ایک گزارش

مفتی عبداللہ ممتاز قاسمی سیتامڑھی
استاذ: شعبۂ عربی زبان وادب واسلامیات
فینے، مالدیپ

اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام کو تا قیامت انسانوں کی رہنمائی کے لیے برپا کیا ہے، اس کے انفرادی، خاندانی، معاشرتی، ملکی اور سیاسی زندگی میں دائمی وآفاقی انتہائی منظم ومستحکم اصول موجود ہیں، لیکن بہت سی مرتبہ ہمارے ان اُصولوں کے صحیح انطباق نہ کر سکنے کی وجہ سے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور بہت سی خرابیاں رونما ہوتی ہیں، خصوصاً رہنمایانِ دین وشریعت کی ذراسی چوک اُمت میں سخت تباہی وبربادی کا ذریعہ بنتی ہے۔

دنیا کے اندر صدیوں تک اسلامی حکومت برپا رہی ہے اور مسلم حکام اپنی کوتاہیوں کے باوجود اپنے عدالتی نظام کو اسلامی آئین وضوابط کے تحت چلاتے رہے ہیں، خلافتِ راشدہ، خلافتِ بنوامیہ اور خلافتِ عباسیہ وفاطمیہ ہر دور میں دارالقضاء کا مضبوط نظام قائم رہا ہے، یہاں تک کہ یہ سلسلہ خلافتِ عثمانیہ کے سنہرے دور کے بعد ختم ہوگیا۔ جب خلافت ختم ہوئی تو دارالقضاء کا اسلامی نظام بھی جاتا رہا، چنانچہ حضرات مفتیانِ کرام نے قاضیوں کی ذمے داریاں بھی سنبھالنی شروع کردیں، جس کی وجہ سے ''فتوی وقضاء کا فرق'' جاتا رہا اور فقہی کتابوں میں جو مسائل قضاء کے لیے لکھے گئے تھے، حضرات مفتیان کرام نے ان کے مطابق فتویٰ دینا شروع کردیا۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''والمفتونَ اليوم غافلون عنه، فإن أكثرهم يفتونَ بأحكامِ القضاء. ووجه الابتلاء فيه: أن المذكور في كتب الفقه عامةً هو مسائل القضاء، وقَلَّما تُذكرُ فيها مسائلُ الدِّيانة. نعم، تذكر تلك في المبسوطات، ولا تُنَال إلا بعد تدرُّبٍ تامٍ، ولعل وجهته أن القاضي في السلطنة العثمانية لم يكن ينصبُ إلا حنفيًا،

بخلاف المفتيين فإنهم كانوا من المذاهب الأربعة، وكان القاضي الحنفي يُنَفِّذُ ما أفتوا به، فشرع المفتُونَ تحرير حكم القضاء لينفِّذ القاضي، فاشتهرت مسائل القضاء في الكتب، ونحملت مسائل الديانة، ثم لا يجبُ أن تتفقَ الديانة والقضاء في الحكم بل قد يختلفان.'' (فیض الباری علی صحیح البخاری، ج:۱،ص:۲۷۲)

''آج کے مفتی حضرات اس (فتوی وقضاء کے فرق) سے غافل ہیں، چنانچہ اکثر مفتیان' احکامِ قضاء کے مطابق فتویٰ دے رہے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ متوسط فقہی کتابوں میں عام طور سے قضائی احکام لکھے ہوئے ہیں اور بہت کم دیانت (فتوی) کے مسائل کا ذکر ہے، ہاں! مبسوطات میں دیانت کے مسائل کا ذکر ہے، لیکن ان (کتابوں کے مسائل دیانت) کو مکمل مشق وتمرین سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ (قضاء کے مطابق فتوی کے چلن کے عام ہوجانے کی) وجہ شاید یہ ہے کہ عثمانی سلطنت میں قاضی کے عہدے پر صرف حنفی مامور ہوا کرتے تھے، جب کہ مفتیان مذاہبِ اربعہ کے تھے، اس لیے حنفی قضاۃ اُن مفتیوں کے فتوے کے مطابق فیصلہ کردیا کرتے تھے، چنانچہ مفتیوں نے قضاء کے احکام لکھنا شروع کردیئے، تاکہ قاضی اس حکمِ قضائی کو نافذ کریں۔ اس طرح کتابوں میں قضاء کے مسائل عام ہوتے چلے گئے اور دیانت (فتوی) کے مسائل ختم ہوتے چلے گئے، جب کہ ہمیشہ قضاء اور دیانت کا حکمِ شرعی یکساں نہیں ہوتا، بہت سی مرتبہ دونوں کے احکام مختلف ہوتے ہیں۔''

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ متاخرین کے دور میں قاضیوں کا علمی معیار گرگیا تھا، قضاۃ کی تقرریاں علمی بنیاد پر کم اور قرابت داری کی بنیاد پر زیادہ ہونے لگی تھیں، اس لیے متاخرین نے قاضی کے فیصلے کو فتوی کے تابع کردیا، تاکہ قاضی اپنی کم علمی کی وجہ سے کچھ غلط فیصلہ نہ کردے۔ شامی نے لکھا ہے: ''القضاء تابع للفتوٰى في زماننا لجهلِ القضاة'' کہ قاضیوں کی جہالت کی وجہ سے اس زمانے میں قضاء فتوی کے تابع ہے، یعنی مفتی قضائی حکم لکھ دیتا تھا اور قاضی اس حکم کی تنفیذ کرتا تھا۔ یہ چلن اتنا عام ہوگیا تھا اور دھڑلے سے مفتیان قضائی حکم فتوی میں لکھنے لگے تھے کہ شامی کو فتاویٰ شامی میں کئی بار توجہ دلانی پڑی کہ عام لوگ جب مسئلہ دریافت کرنے آئے تو مفتی کے لیے ضروری ہے کہ دیانت کے مطابق فتوی دے؛ البتہ اس فتوی میں ''لا يصدق قضاء'' کی صراحت کردے کہ دارالقضاء میں اس فتوے کا اعتبار نہ کیا جائے، تاکہ قاضی اس فتوی کی روشنی میں غلط فیصلہ نہ کردے:

''(و إذا كتب المفتي يدين) أي كتب هٰذا اللفظ بأن سئل مثلا عمن حلف

واستثنى ولم يسمع أحدا يجيب أي لا يحنث فيما بينه وبين ربه ولكن يكتبه بعده ''ولا يصدق قضاء'' لأن القضاء تابع للفتوى في زماننا لجهل القضاة، فربما ظن القاضي أنه يصدق قضاءً أيضا.'' (فتاویٰ شامی، ج:۶،ص:۴۲۱)

تتبُّع وتلاش سے ایسے ڈھیر سارے مسائل ہمارے سامنے آئیں گے، جن میں قضاء ودیانت کا فرق نہیں کیا جارہا ہے اور اس بات کے قائل علامہ کشمیریؒ جیسی شخصیت ہیں، لیکن آج ہم معاشرہ کی بیخ کنی کرتے انتہائی سنگین وحساس مسئلہ یعنی طلاق کے حوالے سے قضاء ودیانت کا فرق نہ کرنے کی وجہ سے ہورہی بے احتیاطیوں پر گفتگو کریں گے۔

آیئے! سب سے پہلے ہم دیانت وقضاء میں فرق سمجھتے ہیں۔

فتویٰ احکام شرعیہ کے متعلق اِخبارِ محض کا نام ہے۔ علامہ قرافیؒ لکھتے ہیں:

''الفتوى محض إخبار عن الله تعالى في إلزام أو إباحة.''

(انوار البروق فی انواء الفروق، ج:۴،ص:۸۹)

لہٰذا مفتی کی ذمے داری بس صورتِ مسئولہ کے مطابق حکم شرعی بتادینا ہے، قطع نظر اس کے کہ صورتِ مسؤلہ نفس الامر کے مطابق ہے یا خلاف۔ شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں:

''يقول المفتي ''الحكم في الصورة المسؤل عنها كذا'' ولا يلزم منه أن تكون الصورة المسؤل عنها موافقة للواقع في نفس الامر.'' (اصول الافتاء وآدابہ:۱۲)

قاضی نفس الامر اور وجودِ خارجی کو جاننے کا مکلف ہے، جب کہ مفتی کا یہ کام قطعی نہیں ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

''القاضي الحاكم يحتاج إلى معرفة المسائل والوقائع أيضا بخلاف المفتي.''

(العرف الشذی شرح سنن الترمذی، ج:۳،ص:۶۹)

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ قضاء کا اپنا میدان ہے اور دیانت یعنی فتویٰ کا اپنا میدان ہے، دونوں کو اپنے حدود میں رہنا اور ان کی پاسداری کرنا چاہیے۔ متعدد فقہاء نے لکھا ہے کہ قاضی کے لیے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے اور اس پر تقریباً تمام اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ جو معاملہ قاضی کے زیرِ سماعت ہو، اس مسئلہ میں قاضی کے لیے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔ ایسے ہی مفتی حضرات کے لیے قضاء کے میدان میں جانا اور دیانت سے بڑھ کر قضائی احکامات کے مطابق فتویٰ دینا درست نہیں ہے۔ اصل مسئلہ پر جانے سے پہلے بطور تمہید چند باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

ایک مجلس میں ایک سے زائد طلاق کی دو شکلیں ہیں:

اول: کوئی یوں کہے: ''میں نے تم کو تین طلاق دی'' یا ''ایک طلاق دو طلاق تین طلاق''

دوم: تین مرتبہ ''طلاق طلاق طلاق'' کہہ دے۔

اول الذکر سے تین طلاق واقع ہو جائیں گی، اس پر ائمہ اربعہؒ کا اتفاق ہے، اس میں کوئی کلام نہیں۔ ثانی الذکر کی تین شکلیں ہیں:

اول: ''طلاق طلاق طلاق'' کہے اور تاسیس/ استیناف کی نیت کرے، یعنی ہر مرتبۂ طلاق میں نئی طلاق کی نیت کرے۔

ثانی: ''طلاق طلاق طلاق'' کہے اور تاکید کی نیت کرے، یعنی اس کی نیت تو ایک ہی طلاق کی ہے، البتہ دوسری اور تیسری طلاق کے تکرار سے طلاق کو مؤکد کرنا مقصد ہے۔

ثالث: ''طلاق طلاق طلاق'' کہے اور اس کی نیت تاسیس یا تاکید میں سے کچھ بھی نہ تھی۔

اس میں بھی شکلِ اول میں تین طلاق واقع ہو جائے گی، ہماری گفتگو آخری شکل میں مذکور دوسری اور تیسری شکل پر ہوگی، یعنی تین مرتبہ "طلاق طلاق طلاق" کہے اور نیت ایک طلاق کی تھی یا نیت کچھ بھی نہ تھی۔

رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے دورِ خلافت کے ابتدائی دو سالوں تک ایسی طلاق جو تین مرتبہ ''طلاق طلاق طلاق'' کہہ دی جاتی تھی، ایک طلاق سمجھی جاتی تھی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چلن بدل جانے اور دیانت کے کم ہو جانے کی وجہ سے اس پر بندش لگا دی اور فرمایا کہ: تین مرتبہ کہی ہوئی طلاق تین طلاق شمار ہوگی۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے نقل کیا ہے:

''كان الطلاق على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم، وأبي بكر، وسنتين من خلافة عمرؓ، طلاق الثلاث واحدة، فقال عمر بن الخطاب: إن الناس قد استعجلوا في أمر قد كانت لهم فيه أناة، فلو أمضيناه عليهم، فأمضاه عليهم.'' (صحیح مسلم، ج:۲، ص:۱۰۹۹)

معروف شارح مسلم امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

''فالأصح أن معناه أنه كان في أول الأمر إذا قال لها: أنت طالق أنت طالق أنت طالق ولم ينو تأكيدا ولا استئنافا يحكم بوقوع طلقة لقلة إرادتهم الاستئناف بذلك، فحمل على الغالب الذي هو إرادة التأكيد، فلما كان في

زمن عمر رضي الله عنه وكثر استعمال الناس بهٰذه الصيغة وغلب منهم إرادة الاستئناف بها حملت عند الإطلاق على الثلاث عملا بالغالب السابق إلى الفهم منها في ذٰلك العصر، وقيل: المراد أن المعتاد في الزمن الأول كان طلقة واحدة وصار الناس في زمن عمرؓ يوقعون الثلاث دفعة، فنفذه عمر.'' (شرح النووی علی مسلم، ج:۱۰،ص:۷۲)

''اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ شروع زمانے میں جب کوئی ''أنت طالق، أنت طالق، أنت طالق'' (تمہیں طلاق ہے، تمہیں طلاق ہے، تمہیں طلاق ہے) کہہ کر طلاق دیتا اور تاکید واستیناف (نئی طلاق کے وقوع) کسی بھی چیز کی نیت نہ کرتا تو ایک طلاق کے وقوع کا حکم لگتا تھا، کیوں کہ لوگ ان الفاظ سے بہت کم استیناف (نئی طلاق کے ایقاع) کا ارادہ کرتے تھے، لہٰذا ان الفاظ کو ان عام معمول پر محمول کیا جاتا، جسے تاکید کہا جاتا ہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا اور طلاق کے لیے ان الفاظ کا استعمال بکثرت ہونے لگا اور عام طور سے ان کی نیت استیناف کی ہوتی تھی، چنانچہ مطلق تین مرتبہ (طلاق طلاق طلاق کہنے) کو تین طلاق پر محمول کیا گیا، اسی سابقہ غالب معمول پر عمل کرتے ہوئے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ قضائی معاملہ کے لیے تھا، دیانت کے لیے قطعاً نہیں تھا، چوں کہ قاضی کا کام ظاہر کے مطابق حکم شرعی لگانا ہے، اور اس نے تین مرتبہ ''طلاق طلاق طلاق'' کہہ دی ہے تو ظاہر یہی ہے کہ اس نے تین طلاق دی ہوگی، لیکن مفتی کا کام دیانت کے مطابق فتویٰ دینا ہے، وہ قضائی حکم کے مطابق فتویٰ نہیں دے سکتا، اس لیے اگر کسی نے تین مرتبہ ''طلاق طلاق طلاق'' کہہ دی تو مفتی کے لیے مطلق تین طلاق کا فتویٰ لکھ دینا درست نہیں ہے۔

بالخصوص ہندوستانی و پاکستانی معاشرے میں جہالت کی بنا پر تین سے کم طلاقوں کو طلاق سمجھا ہی نہیں جاتا۔

شاید ہی کہیں ایسا ہوتا ہے کہ نارمل حالت میں طلاق دی گئی ہو، ورنہ عام طور سے غصہ کے عالم میں ہی طلاق کی نوبت آتی ہے، ایسے میں انسان بس ''طلاق طلاق طلاق'' کہہ دیتا ہے، اس کی نیت استیناف یا تاکید کی نہیں ہوتی ہے۔

اس صورت حال کو جاننے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں:

❶:- اگر کوئی تین مرتبہ ''طلاق طلاق طلاق'' کہہ دے اور معاملہ دارالقضاء آئے تو قاضی

ثبوت وشواہد کی روشنی میں صورتِ حال کا جائزہ لے کر اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کرے، اگر فیصلہ میں خطا ہوبھی گئی تو وہ ایک اجر سے محروم نہیں ہوگا۔

❷:- اگر معاملہ دارالافتاء آئے اور وہ بصراحت کہے کہ میری نیت ایک کی تھی تو ایک طلاق واقع ہوگی۔

❸:- اگر معاملہ دارالافتاء آئے اور استفتاء میں اپنی نیت استیناف/تاکید کی صراحت نہ ہو تو مفتی اس نیت کی وضاحت طلب کرے اور مستفتی کی وضاحت کے مطابق فتوی دے، یعنی اگر وہ تاکید کی نیت بتائے تو تاکید اور استیناف کی نیت بتائے تو استیناف۔

❹:- اگر معاملہ دارالافتاء آئے اور وضاحت طلب کرنے پر جواب آئے کہ ''میری کوئی نیت نہ تھی، بس تین بار طلاق طلاق طلاق کہہ دی'' تو اسے معاشرہ کی صورت حال کی وجہ سے ایک طلاق سمجھی جائے اور ایک طلاق کا فتویٰ دیا جائے، جیسا زمانۂ نبوی، خلافتِ صدیقی اور خلافتِ فاروقی کے ابتدائی دوسالوں میں ہوتا رہا ہے۔

پیدا ہونے والے اشکالات کے جوابات

نمبر ایک پر یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ اگر قضائی تھا تو پھر موجودہ وقت کے قضاۃ حضرات کو اپنی صوابدید کے مطابق وقوع اور عدم وقوع طلاق کے فیصلہ کا اختیار کیسے دیا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو وقوع طلاق کا فیصلہ کیا تھا اس کی دو وجہ تھی۔

۱:- چلن کا بدل جانا ۲:- دیانت کا کم ہوجانا

موجودہ حالات میں دیانت کی کمی تو دورِ عمری سے ہزار گنا زائد ہے، لیکن ہمارے یہاں دینی شعور کی کمی اور جہالت کی وجہ سے چلن پھر سے بدل چکا ہے اور چلن بدل جانے کی وجہ سے قاضی رواج کے مطابق فیصلہ کرسکتا ہے۔ ''مجموعہ قوانینِ اسلامی'' میں ہے:

> ''اور اگر طلاق دینے والا یہ کہتا ہے کہ اس کی نیت ایک ہی طلاق کی تھی اور اس نے محض زور پیدا کرنے کے لیے الفاظِ طلاق دہرائے ہیں، اس کا مقصد ایک سے زائد طلاق دینا نہیں تھا تو اس کا یہ بیان حلف کے ساتھ تسلیم کیا جائے گا اور ایک ہی طلاق واقع ہوگی اور اگر طلاق دینے والا یہ کہتا ہے کہ اس کی کچھ بھی نیت نہیں تھی، نہ ایک کی اور دو یا تین کی، دیکھا جائے گا کہ عرف میں ایسے مواقع پر تاکیداً الفاظ دُہرانے کا رواج ہے یا نہیں؟ اگر عرفِ غالب یہ ہو کہ ایسے

مواقع پر لوگ محض کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے بار بار اُسی لفظ کو دہراتے ہیں تو عرف کے تقاضوں کی رعایت کرتے ہوئے الفاظ کی تکرار کو تاکید پر محمول کر کے ایک ہی طلاق واقع کی جائے گی۔'' (مجموعہ قوانینِ اسلامی، ص: ۱۹۴)

چنانچہ بینہ وثبوت اور عرف کو ملحوظ رکھ کر قاضی ایک یا تین کا فیصلہ کر سکتے ہیں، اگر وہ مصیب ہوئے تو دو اَجر کے مستحق ہوں گے اور اگر مخطی ہوئے تو ایک اَجر کے۔ ارشادِ نبوی ہے:

''إذا حكم الحاكم فاجتهد فأصاب، فله أجران، وإذا حكم فأخطأ، فله أجرٌ واحدٌ.'' (سنن الترمذی: ۱۳۲۶)

نمبر دو اور تین پر حضرات مفتیانِ کرام کی طرف سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ اس طرح لوگ تین کی نیت سے طلاق دیں گے اور ایک کا فتویٰ حاصل کر لیں گے۔

جواب بڑا سادہ اور سیدھا ہے کہ ہمارا تو کام ہی ''اِخبارِ محض'' ہے، اس نے زبان یا تحریر سے جیسا بتایا ہمارا کام اس کے مطابق فتویٰ دے دینا ہے، اب معاملہ ''فیما بینه و بین الله'' ہے۔ اگر اس نے جھوٹ بول کر آپ سے فتویٰ حاصل کیا ہے، یعنی اس کی نیت استیناف کی تھی اور ''تاکید کی نیت یا بلا نیت'' کہہ کر ایک طلاق کا فتویٰ حاصل کر لیا تو یقیناً اس کا مؤاخذہ آپ سے نہیں ہوگا، عنداللہ اس کا جوابدہ وہ خود ہوگا، لیکن اگر اس کی نیت وہی تھی جو وہ زبان سے کہہ رہا ہے، یعنی تاکید کی تھی یا بلا نیت تھی اور آپ نے تین طلاق کا فتویٰ لکھ کر اس کے گھر کو توڑ دیا، اس کے بچوں کو بکھیر دیا اور طلاق کی وجہ سے جو انتہائی خطرناک اثرات مرتب ہوتے ہیں، وہ ان کی زندگی پر ہوئے تو یقیناً کہیں نہ کہیں اس جرم میں آپ کا شمار ہوگا اور اس طلاق کی وجہ سے ہونے والے تمام تر برے اثرات کے آپ ذمہ دار ہوں گے اور اس کے لیے عنداللہ جوابدہ ہونا پڑے گا۔ جان لیجیے! اسے ''اجتہادی خطا'' کہہ کر بھی نہیں ٹالا جا سکے گا۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے حدیث: ''إذا حكم الحاكم فاجتهد فأصاب، فله أجران، وإذا حكم فأخطأ، فله أجر واحد.'' (ترمذی: ۱۳۲۶) کے متعلق ''عقد الجید'' شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حوالے سے حاشیہ لکھا ہے:

''إن حديث الباب في حق القاضي لا في حق المفتي أو المجتهد، والقاضي الحاكم يحتاج إلى معرفة المسائل والوقائع أيضا بخلاف المفتي.'' (العرف الشذی شرح سنن الترمذی، ج: ۳، ص: ۶۹)

''حدیثِ مذکور قاضی کے حق میں ہے نہ کہ مفتی یا مجتہد کے حق میں (کہ اگر وہ مصیب رہا تو دوگنا

اَجر اور اگر مخطی رہا تو ایک گونا اَجر) چوں کہ قاضی مسائل جاننے کے ساتھ تحقیقِ واقعہ کا بھی مکلف ہے، برخلاف مفتی کے (کہ انھیں تحقیقی واقعہ کی ضرورت نہیں، ان کے لیے مسائل کا علم کافی ہے)۔''

نمبر دو والی شکل کو اگر آپ بغور دیکھیے تو اس مسئلہ کو لے کر دارالافتاء آنے والے ہر شخص کو آپ جھوٹا اور فریبی فرض کر کے فتویٰ لکھتے ہیں، یعنی جس بھی آدمی کے ساتھ یہ حادثہ پیش آئے اور وہ آپ سے فتویٰ طلب کرے، گو کہ وہ سچا اور دین دار آدمی ہے، خوفِ خدا کی وجہ سے دارالافتاء آیا ہے، لیکن آپ بلا کسی دلیل کے اسے جھوٹا مان لیتے ہیں کہ یقیناً یہ جھوٹ بول رہا ہے اور پھر قضاء کے مطابق تین طلاق کا فتویٰ لکھ دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ اُصولِ فتویٰ اور اُصولِ شریعت دونوں کے خلاف ہے۔

نمبر دو پر ہونے والے اعتراض کا واضح جواب یہ بھی ہے کہ اس اندیشہ کو تمام اہلِ مراجع نے محسوس نہیں کیا، بلکہ انہوں نے بصراحت لکھا کہ اگر مستفتی اقرار کرتا ہے کہ اس نے تین مرتبہ ''طلاق طلاق طلاق'' کہی ہے، لیکن نیت ایک کی تھی تو مفتی ایک طلاق کے وقوع کا ہی فتویٰ دے گا۔

نمبر چار پر یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ زمانۂ نبوی اور خلافتِ صدیقی میں چوں کہ تین مرتبہ ''طلاق طلاق طلاق'' کہنے کے باوجود ایک کی نیت کا ہی چلن تھا، جیسا کہ امام نوویؒ کی عبارت سے واضح ہے، لیکن اب ایسی صورت حال نہیں ہے۔ اس کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے کہ زمانہ اب بھی وہی ہے، اب بھی لوگ تین مرتبہ ''طلاق طلاق طلاق'' کہہ کر ایک طلاق واقع ہونا ہی سمجھتے ہیں، بس ایسا سمجھنے کی وجہ میں فرق ہے، قرنِ اول میں ایمان کی پختگی، شرعی علوم سے گہری واقفیت اور عنداللہ جوابدہی کے خوف سے ایسا چلن تھا، اب جہالت، شرعی علوم سے ناواقفیت اور فلم وسیریل بینی کے اثر سے ایسا چلن ہے۔ بہرحال نتیجہ کے اعتبار سے دونوں کی صورت حال برابر ہے، اس لیے حکم شرعی بھی برابر لگنا چاہیے، یعنی جو حکم پہلے لگتا تھا، وہی حکم اب بھی لگنا چاہیے۔ مجموعہ قوانینِ اسلامی کا حوالہ گزر چکا ہے۔

اسی قبیل سے جھوٹی طلاق کے اقرار کا مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے اس ارادے کے ساتھ کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے کہہ دے کہ ''میں تمہیں طلاق دے چکا ہوں'' یا کسی نے اس کی بیوی کو زبردستی طلاق دلانے یا طلاق نامہ پر دستخط کرانے کی کوشش کی اور اس نے جھوٹ کہہ دیا کہ وہ اپنی بیوی کو پہلے ہی طلاق دے چکا ہے تو دیانۃً اس کی بیوی پر طلاق واقع نہ ہوگی، یعنی مفتی حضرات وقوعِ طلاق کا فتویٰ نہیں دے سکتے، البتہ اگر معاملہ دارالقضاء جاتا ہے تو ثبوت وشواہد کی روشنی میں قاضی طلاق واقع کردے گا۔ فتاویٰ شامی میں ہے:

''المفتي يفتي بالديانة) مثلا إذا قال رجل: قلت لزوجتي أنت طالق قاصدا بذلك الإخبار كاذبا فإن المفتي يفتيه بعدم الوقوع والقاضي يحكم عليه بالوقوع.'' (ردالمحتار، ج:۵،ص:۳۶۵)

مفتی کا کام دیانت کے مطابق فتویٰ دینا ہے، چنانچہ اگر کسی نے اپنی بیوی سے کہا: ''أنت طالق'' (تم مطلقہ ہو/تم کو طلاق دے چکا ہوں) اس ارادے کے ساتھ کہ وہ جھوٹی خبر دے رہا ہے تو مفتی عدمِ وقوعِ طلاق کا فتویٰ دے گا اور (اگر معاملہ دارالقضاء جاتا ہے تب) قاضی وقوعِ طلاق کا فیصلہ کرے گا۔

کسی نے اپنی بیوی کو ہنسی مذاق میں کہہ دیا کہ ''میں تمہیں طلاق دے چکا ہوں'' یا اپنے دوستوں کی مجلس میں تفریحاً اقرار کیا کہ میں تو بیوی کو طلاق دے چکا ہوں، تب بھی اس پر دیانۃً (فتوی کی رو سے) طلاق واقع نہ ہوگی:

''ولو أقر بالطلاق كاذبًا أو هازلًا وقع قضاءً لا ديانةً.'' (ردالمحتار، ج:۳،ص:۲۳۶)

مذکورہ بالا دونوں مسائل میں بھی دارالافتاء سے وقوعِ طلاق کے فتاویٰ صادر ہوتے ہیں اور ان کی مضبوط دلیل رسول اللہ ﷺ کا فرمان: ''ثلاث جدهن جد، وهزلهن جد: النكاح، والطلاق، والرجعة.'' (ابوداود: ۲۱۹۴) ہوتی ہے، جب کہ اس روایت کے حوالے سے ''انشاءِ طلاق اور اخبارِ طلاق میں فرق'' اور اس کی وجہ سے قضاء و دیانت کا فرق کرنا بھول جاتے ہیں، یعنی اگر انشاءِ طلاق ہنسی مذاق میں بھی واقع ہوجاتی ہے، مثلاً ہنسی مذاق میں یوں کہہ دے کہ ''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں'' تو طلاق واقع ہوجائے گی، لیکن اگر ہنسی مذاق میں اقرارِ طلاق کرلے کہ میں تمہیں طلاق دے چکا ہوں تو فتوی کی رو سے طلاق واقع نہ ہوگی، البتہ قضاء کی رو سے طلاق واقع ہوجائے گی۔ (حوالہ سابق دیکھیں)

چوں کہ اگر ہنسی مذاق میں بھی کیے گئے اقرار کی بناء پر نکاح، طلاق اور رجعت کے احکام قضا کے اعتبار سے نافذ نہ کیے گئے تو معاملات خراب ہوجائیں گے اور قاضی کے لیے فیصلہ کرنا دشوار ہوجائے گا، کیوں کہ وہ ظاہر کے مطابق حکم لگانے کا مکلف ہے، اس کا مقصد ہزل تھا یا جِد، اپنے قول میں وہ سچا تھا یا جھوٹا، اس سے قاضی کو کوئی مطلب نہیں، چنانچہ اگر کسی شخص نے دو آدمیوں کو پہلے سے گواہ بنا دیا کہ میں اپنی بیوی کو جھوٹی طلاق کی خبر دوں گا، تم گواہ رہو اور بیوی کو جھوٹی طلاق کی خبر دے دی کہ ''میں تمہیں طلاق دے چکا ہوں/تم مطلقہ ہو'' اب اگر یہ معاملہ دارالقضاء جاتا ہے تب بھی قاضی وقوعِ طلاق کا فیصلہ نہیں کرے گا۔ درِمختار میں ہے:

''قال: أنت طالق أو أنت حر وعنى الإخبار كذبًا وقع قضاء، إلا إذا أشهد

علی ذٰلك.'' (الدرالمختار وحاشیہ ابن عابدین، ج: ۳، ص: ۲۹۳)

اس سے صاف واضح ہے کہ حدیث مذکور کا اطلاق عمومی نہیں ہے، بلکہ یہ امورِ قضا کے ساتھ مخصوص ہے، اگر حکم عمومی ہوتا تو جھوٹی طلاق سے پہلے گواہ بنانے یا نہ بنانے سے کچھ فرق نہ پڑتا اور بتقاضۂ عموم بہرحال اس پر طلاق واقع ہوجاتی۔

بہرحال! ان سب کے باوجود دارالافتاؤں کا چلن یہی ہے کہ ان سب مسائل میں وہ حکم قضاء کے مطابق فتویٰ لکھتے ہیں اور ان مقامات میں جہاں طلاق واقع نہیں ہونی چاہیے، وہاں بھی بے پروا ہوکر طلاق واقع کردیتے ہیں، اس کی اصل وجہ علامہ کشمیریؒ کے بقول ''دیانت وقضاء میں فرق سے غفلت ہے اور متداول کتبِ فقہ میں جہاں بیشتر مسئلے قضاء کے لکھے ہوئے ہیں، ان کے مطابق فتوے لکھنا ہے۔''

میرے تخمینہ کے مطابق دارالافتاؤں میں ستر اسی فیصد سوالات طلاق یا میراث کے آتے ہیں، جن میں چالیس سے پچاس فیصد سوالات طلاق کے ہوتے ہیں، یعنی معاشرہ طلاق کی آگ میں بری طرح جھلس رہا ہے، طلاق کی وجہ سے صرف میاں بیوی جدا نہیں ہوتے، بلکہ دو خاندان ٹوٹ جاتے ہیں، بچوں پر جو سنگین اثرات پڑتے ہیں، وہ اتنے خطرناک ہیں کہ انھیں بیان کرنے کے لیے مستقل ایک مقالہ چاہیے۔

میرا خیال ہے کہ اگر ان مسائل پر توجہ دی گئی تو یقیناً طلاق کی شرح معاشرہ سے کم ہوجائے گی اور اس لعنت کی وجہ سے برپا ہونے والے فساد جس سے قوم تباہ ہورہی ہے اور ان کا مستقبل خاکستر ہورہا ہے، ان سے کسی حد تک بچ پانا ممکن ہوگا۔ اللہ کرے کہ اربابِ فتاویٰ، سنجیدہ علمی شخصیات اور دردمند اہلِ علم اس سنگین مسئلہ میں غور کریں اور امت جس مسئلہ سے بری طرح جھلس رہی ہے، اس سے انھیں نجات دلانے میں فقہی مشاورتی عمل کے مقررہ اصولوں کے مطابق لاعلم عوام کی مدد کریں اور ان کی دینی راہنمائی کریں، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے۔ وھو المصیب

ایک درخواست

یہ میرے ناقص فکر ومطالعہ اور علمی وعوامی تجربہ کا حاصل ہے، کوئی انسان لغزش وخطا سے خالی نہیں، اس لیے اگر اہلِ علم ونظر قارئین کو اس تحریر میں کوئی قابلِ اشکال پہلو یا لائقِ اصلاح بات نظر آئے تو نشان دہی فرمادیں، بے حد شکرگزار ہوں گا۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

حیات وخدمات

مولانا محمد عمر نظام آبادی
مدیر: التذکیر فاؤنڈیشن، نظام آباد، انڈیا

سرزمینِ ہند پر جتنی اہم اور تاریخ ساز شخصیات رونما ہوئیں، ان میں علمائے دیوبند سرفہرست ہیں، انھیں میں ساداتِ عظام اور خانوادۂ مدنی میں بھی بہت سی قابلِ ذکر ہستیاں ظہور پذیر ہوئیں، جو سب کے سب علم وتقویٰ کے حامل تھے، لیکن خالقِ کائنات نے اس خاندان پر مزید احسان یہ فرمایا کہ آخری دور میں ایک ایسی عہد ساز، رجال کار شخصیت کو وجود بخشا، جسے آگے چل کر ایک مجاہدِ جلیل، محدثِ کبیر، جانشینِ شیخ الہند، خلیفۂ گنگوہی، اور مدرسِ مسجدِ نبوی متعارف ہونا تھا، یعنی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکت۔

آپ اگر ایک طرف تقویٰ وطہارت میں شانِ قطبیت رکھتے تھے تو دوسری جانب ارشاد و طریقت میں شانِ مجددیت کے حامل تھے۔ ایک طرف دریائے علم وعمل کے شناور تھے تو دوسری جانب میدانِ سیاست کے شہسوار بھی تھے۔ نیز ایک طرف اتباعِ سنت، اخلاقِ نبوت، سیرتِ صحابہؓ اور اُسوۂ مشائخ کا سرچشمہ تھے، تو دوسری جانب جذباتِ حریت، ترقیِ ملت، حبِ وطن، ہمدردیِ خلقِ خدا، غمخواریِ نوعِ انسانیت، اور ایثار وقربانی جیسے عمدہ شمائل وخصائل سے سرشار تھے، اس لیے کہ آپ کا قلب حاملِ شریعت اور عمل تفسیرِ شریعت تھا، ذکر اللہ آپ کی روح، اتباعِ شریعت آپ کی جان، ایثار آپ کی فطرت، حلم وبردباری آپ کی جبلت، اور جُود وعطا آپ کی خصلت تھی، مختصر یہ کہ آپ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔

ولادت وتسمیہ

آپ کی ولادت باسعادت ۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۸ء کو قصبہ بانگرانا ؤ میں ہوئی،

آپ کا نامِ نامی اسم گرامی ''حسین احمد'' اور تاریخی نام ''چراغ محمد'' رکھا گیا۔

آغازِ تعلیم

آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار کی زیرِ نگرانی ہوئی، جب پانچ برس کے قریب ہوئے تو آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کو قاعدہ بغدادی اور عم پارہ پڑھایا، اور قرآن مجید کے پانچ پارے ان ہی سے پڑھے، گھریلو تعلیم کے ساتھ ساتھ اسکول کی تعلیم بھی حاصل کی، اس طرح سے کہ اس میں امتیازی پوزیشن حاصل کی، اور جب آپ ۱۳ سال کے ہوئے، تو آپ ۱۳۰۹ھ میں دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور اپنے بڑے بھائی مولانا صدیق احمد صاحب اور مشفق استاذ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں رہ کر حصولِ علم اور کسبِ فیوض میں منہمک رہے۔ آپ اپنے زمانۂ طالب علمی میں اپنے تمام زملاء درس و رفقاء زمن میں سب سے لائق و فائق اور ممتاز رہے، اور ہمیشہ امتحانات میں اعلیٰ نمبرات سے فوز یاب اور کامیاب رہے، یہاں تک کہ ساڑھے چھ سال تک تعلیم پاکر علوم وفنون میں بامِ عروج حاصل کر کے ۱۳۱۶ھ میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے، اس قلیل عرصہ میں آپ نے ۱۷ فنون پر مشتمل درسِ نظامی کی ۶۷ کتابیں پڑھیں، علمِ نبوت کے نیرِ اعظم بن کر دارالعلوم کے در و دیوار کو منور کیا۔

اتالیق واساتذہ

زمانۂ طالب علمی میں ہر ایک استاذ کی نظرِ شفقت آپ پر پڑتی تھی، تمام اساتذہ کی دل وجان سے خدمت کرتے تھے، آپ کے اساتذہ میں بطور خاص استاذ الاساتذہ مرجع العلماء شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت مولانا عبدالعلی محدث دہلویؒ، شیخ الحدیث مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ شامل ہیں۔

درس وتدریس

دارالعلوم سے فراغت کے بعد آپ اہل وعیال کے ساتھ مدینہ منورہ روانہ ہوگئے، رخصتی کے وقت شیخ الہندؒ نے ایک ایسی نصیحت کی تھی کہ جس کا آپ نے تادمِ زیست اہتمام کیا، وہ یہ کہ ''پڑھانا ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیے، ایک دو ہی طالب علم ہوں۔'' مدینہ منورہ پہنچ کر آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا اور کم وبیش چودہ برس مسجدِ نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں خدمتِ درس انجام دیتے رہے، اور اس دوران تین دفعہ ہندوستان کا سفر ہوا، جس میں چار سال صرف ہوئے، پھر شیخ الہندؒ کے ہمراہ مالٹا کی جیل میں اسیر ہوگئے۔ اسارتِ مالٹا سے واپسی کے بعد امروہہ کے مدرسہ جامع مسجد میں تدریسی فرائض سرانجام دینے لگے، پھر حضرت شیخ الہندؒ کے ایماء پر کلکتہ کے لیے روانہ ہوگئے،

کراچی کے مشہور مقدمہ تک تدریس میں مشغول رہے، پھر گرفتاری کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا، اور ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۸ء تک تقریباً چھ سال بنگال میں اور سلہٹ کے جامعہ اسلامیہ میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے پڑھاتے رہے، اس ۳۱ سالہ زمانۂ تدریس میں ہزاروں افراد (تلامذہ اور مسترشدین) آپ کے فیضِ علمی سے مستفید ہوئے۔

تصوف وطریقت

جب علومِ ظاہری سے آراستہ ہونے کے بعد علومِ باطنی کی فکر دامن گیر ہوگئی، تو حضرت شیخ الہندؒ سے اظہارِ خیال کیا، تو انہوں نے سید العارفین حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی جانب رہنمائی فرمائی، تو تعمیلِ حکم میں اُن سے بیعت ہوگئے، اور روحانی کمالات کا اکتساب کیا، بالآخر ان کے خلیفہ مجاز ہوئے، پھر اس کے بعد آپ کے وعظ وارشاد، بیعت وتلقین کے ذریعے لاکھوں افراد کی اصلاح ہوئی، اور ہزاروں طالبینِ حق اور رہ نوردانِ سلوک وطریقت آپ کے روحانی و باطنی کمالات و ملکات سے فیض یاب و سیراب ہوئے، ۱۶۷ حضرات آپ کی طرف سے اجازت وبیعت وخلافت سے سرفراز ہوئے:

کیا لوگ تھے جو راہِ وفا سے گزر گئے
جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

تحریکِ آزادی میں خدمات

آپ نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں تحریکِ ریشمی رومال، تحریکِ خلافت اور جمعیۃ علمائے ہند کے پلیٹ فارم سے قائدانہ کردار ادا کیا، حضرت شیخ الہندؒ کے وصال کے بعد ملّی قیادت کا فریضہ انجام دیا اور ان کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا، اور حصولِ آزادی کی خاطر چار بار قید و بند کی آزمائش سے ہمکنار ہوئے اور تقریباً ساڑھے سات سال اسیرِ فرنگ رہے۔ آپ نے آزادی کے لیے جہاں بے شمار قربانیاں دیں اور کوششیں کیں، ان سب میں آپ کی بنیادی فکر یہ رہی کہ آپس میں اختلاف نہ ہو، ملک کے اس وفادار اور جانباز سپاہی نے جب سے حصولِ آزادی کے لیے جد وجہد کی زمام کو تھاما، تب ہی سے ملک میں بسنے والے تمام طبقات اور جماعتوں کے مابین تشدد واختلاف اور تفریق وامتیاز کو ختم کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے، اور ہر اعتبار سے تمام مذاہب کے ماننے والوں کو جمہوریت، اور اتحاد ویکجہتی کا وہ سنہرا درس دیا، جو ناقابلِ فراموش ہے اور کسی دیدہ ور سے مخفی بھی نہیں، نیز تمام برادرانِ وطن کے سامنے اپنی اس فکر کا اظہار بے دریغ الفاظ میں کرتے ہوئے کہا:

''ہندوستان کبھی بھی سیاسی اور ملکی معاملات میں ہندو مسلم تفریق وامتیاز کا قائل نہیں ہوا ہے، اس کی حکومتیں مسلم حکمرانوں کے زیرِ اثر رہی ہوں یا ہندو فرمانرواؤں کے زیرِ نگیں،

کبھی بھی افتراق و امتیاز سے آشنا نہیں ہوسکیں۔''

(شیخ الاسلام ایک سیاسی مطالعہ، ص: ۴۲۱، مؤلفہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری)

آپ کی یہ جمہوری فکر یہیں پر تام نہیں ہوتی، بلکہ تحریکِ آزادی کی شبانہ روز جدوجہد کو جمہوری رنگ وروغن سے آشنا کرنے کے لیے ۱۹۴۵ء میں سہارنپور کی سرزمین سے تمام طبقات کو اُخوت و بھائی چارگی اور جمہوریت کا درس ان الفاظ میں دیتے ہوئے کہا:

''میرے محترم! وطن اور ابنائے وطن کی بربادی اور اس کے اسباب کسی خاص مذہب، کسی خاص برادری، کسی خاص شخص تک محدود نہیں ہوسکتے، وطن اور ملک کی بربادی جملہ ساکنینِ ملک کو برباد کرے گی اور کررہی ہے، ناؤ ڈوبتی ہے تو اس کے تمام سوار ڈوبتے ہیں، گاؤں میں آگ لگتی ہے تو سبھی گھر جلتے ہیں، اسی طرح یہ غلامی ومحکومیت جملہ اہلِ وطن کو موت کے گھاٹ اُتار رہی ہے، کیا اس میں فقط ہندو مرے، یا فقط مسلمان مرے؟ نہیں، سبھوں کی بربادی ہوئی، ایسے وقت میں ہر ادنیٰ سمجھ والا بھی اپنے داخلی وخارجی جھگڑوں کو چھوڑ کر ضروری سمجھتا ہے کہ مصیبتِ عامہ کو سب سے پہلے زائل کردینا چاہیے، اس وقت تک چین نہ لینا چاہیے اور نہ اپنے داخلی وخارجی جزئی جھگڑوں کو چھیڑنا چاہیے، جب تک یہ مصیبت نہ ٹل جائے۔''

حضرت شیخ الاسلامؒ کے سوانحی اوراق میں موجود یکجہتی اور جمہوری فکر کی بابت آپ کا یہ لطیف استدلال آج بھی ہمارے لیے خضرِ طریق کی حیثیت رکھتا ہے کہ:

''وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ'' یہ آیت صاف صاف بتلا رہی ہے کہ مسلمانانِ ہند کے لیے اتحاد ضروری ہے، کیونکہ وہ فوج جس کے ذریعہ ہم دشمن کو لڑا سکتے ہیں اور اس کے پتھریلے دماغ کو پگھلا سکتے ہیں، وہ اہلِ ہند کے لیے ظاہری حیثیت سے اتحادِ ہندو مسلم اور صرف اتحادِ ہندو مسلم ہے، اس لیے یہ اتحاد اور قومی یکجہتی مذہبی حیثیت سے جائز ہی نہیں، بلکہ ضروری بھی ہوگا۔

(حیاتِ شیخ الاسلام، ص: ۱۱۷، مؤلفہ: حضرت مولانا محمد میاںؒ)

حلیہ اور وضع قطع

''آپ جسمانی صفتوں کے اعتبار سے اچھے درمیانہ قد کے تھے، پیشانی چوڑی اور کشادہ اور آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ، ناک نہ زیادہ اُٹھی ہوئی اور نہ زیادہ لمبی، بلکہ متوسط، اور گندمی رنگ اور ہنس مکھ چہرے کے مالک تھے، نیز جسم مضبوط اور سینہ نہایت چوڑا تھا، فطرۃً قوی، باوقار، باہیبت، لیکن بگڑے یا سخت چہرہ والے نہ تھے۔'' (ایک ہفتہ شیخ الہند کے دیش میں)

ازواج واولاد

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے معاصرین میں جہاں بے شمار امتیازات وخصوصیات حاصل ہیں، تو وہیں یہ بھی کہ آپ نے اپنی زندگی میں کل چار نکاح کیے: چنانچہ آپ کا پہلا نکاح موضع قتال پور ضلع اعظم گڑھ میں ہوا، جن سے دولڑکیاں ہوئیں، ایک کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا، اور جب آپ مالٹا میں اسیر ہوئے، تو آپ کے اہلِ وعیال ملکِ شام منتقل ہوگئے، وہیں پر دوسری بیٹی آسودۂ خاک ہوگئی۔ آپ کا دوسرا نکاح قصبہ بچھرایوں ضلع مرادآباد میں ہوا، ان سے دوصاحبزادے ہوئے: اخلاق احمد اور اشفاق احمد، لیکن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ پہلا آٹھ سال اور دوسرا ڈیڑھ سال کی عمر میں فوت ہوگیا، اور اہلیہ محترمہ کا بھی مدینہ منورہ میں ہی وصال ہوگیا۔ پھر آپ نے دوسری اہلیہ کے انتقال کے بعد انہی کی چھوٹی بہن سے نکاح کیا، جن سے حضرت مولانا سید اسعد مدنی اور ایک صاحبزادی ہوئی، پھر قیامِ سلہٹ کے زمانہ میں صاحبزادی بھی جاں بحق ہوگئی، حضرت مولانا سید اسعد مدنی کی والدہ ماجدہ بھی ۱۳۵۵ھ میں دیوبند میں مالکِ حقیقی سے جاملیں۔ پھر اس کے بعد آپ کی چوتھی شادی اپنے چچازاد بھائی کی منجھلی صاحبزادی سے ہوئی، جن سے حضرت مولانا محمد ارشد مدنی دامت برکاتہم، اور مولانا اسجد مدنی اور پانچ صاحبزادیاں ہوئیں۔

آپ کی چند مشہور اور اہم تصانیف

۱:۔نقشِ حیات ۲ جلدیں (خود نوشت سوانح)، ۲:۔سفرنامۂ شیخ الہند، ۳:۔الشہاب الثاقب، ۴:۔مکتوباتِ شیخ الاسلام، ۵:۔متحدہ قومیت، ۶:۔الخليفة المهدي في الأحاديث الصحيحة، وغیرہ۔

وفاتِ حسرتِ آیات

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء سے ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء تک کی اس چالیس سالہ مدت میں اُمت کی بے لوث اور بے نظیر خدمات سرانجام دیں، بالآخر ۱۳/ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ (۵/ دسمبر ۱۹۵۷ء) کو دستورِ خداوندی کے مطابق علم وعمل اور زہد وتقویٰ کا یہ آفتاب عالم تاب دیوبند کے اُفق پر غروب ہوگیا، إنا لله و إنا إليه راجعون. ہزاروں عقیدت مندوں نے شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی امامت میں آپ کی نمازِ جنازہ پڑھی، اور قبرستانِ قاسمی دیوبند میں تدفین عمل میں آئی۔

پروردگارِ عالم ہمیں بھی حضرت کے علوم ومعارف کا کچھ حصہ نصیب فرمائیں اور اُن کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین

امیر الہند حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان منصور پوریؒ

مولانا محمد فہیم الدین بجنوری
مدرس دار العلوم دیوبند، انڈیا

حُرمتِ منصب وکلاہ، زینتِ مسندِ تدریس

نگہ بلند سخن دل نواز جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

.....

سانحۂ وفات

باغِ جہاں سے صورتِ شبنم چلے گئے
کیا کیا کلاہ و مسند و پرچم چلے گئے

مرگِ ناگہانی کی تازہ لہر شباب پر ہے، لفظ ''بخار'' ہاتفِ غیبی کے مترادف ہوگیا ہے، روزمرہ کے معمولی امراض کی علامتیں، سفرِ آخرت کا پیش خیمہ ثابت ہورہی ہیں، عوام الناس کے ساتھ، خواص بھی متواتر رخصت ہورہے ہیں، ملکِ عزیز کا یہ وہ منظر ہے، جس میں کل گزشتہ، بروز جمعہ، ۸ شوال ۱۴۴۲ھ-۲۱ مئی ۲۰۲۱ء کو، استاذِ حدیث ومعاون مہتمم دار العلوم دیوبند، صدر جمعیت علمائے ہند، امیر الہند حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان منصور پوریؒ کا سانحۂ وفات پیش آیا، إنا لله وإنا إليه راجعون، اللّٰهم اغفر له وارحمه وأسكنه فسيح جناتك، وأنزل الصبر والسلوان علىٰ ذويه، آمين يا رب العالمين.

آپ کی بیماری کے تعلق سے اُمید وبیم کا ایک سلسلہ جاری تھا، حادثہ ہو چکا، تو ذہن نے ربع

صدی کے حافظے کا جائزہ لیا، بہت سی یادوں نے دل گیر کیا، صدمۂ نو بہترین کا رساز بھی ہے، عالمِ اَشک میں تیار کردہ نذرانۂ عقیدت اپنا رنگ وآہنگ رکھتا ہے، کورونا کا عطا کردہ قفس بھی معاون ہے، لہٰذا رواروی میں حافظے کے انتخاب کی چند سطریں پیش ہیں:

دارالاقامہ

مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں، میری حاضری سن ۱۹۹۷ء کو ہوئی، اس وقت حضرت الاستاذؒ دیگر متعدد ومتنوع ذمے داریوں کے ساتھ دارالاقامہ کے مرکزی وکلیدی عہدے پر جلوہ افروز تھے، صیغہ ہائے انتظام کی نسبت، آپ کا امتیاز قدیم الایام سے متفق علیہ رہا ہے، دارالاقامہ میں نظم کی پیہم تبدیلیوں کے پس منظر میں عبوری مرحلے کی صورت تھی، آپ کی آمد سے انتظام میں بہتری واستحکام آیا، اس ضمن میں شعبے سے متعلق ماتحت نظماء کے علاوہ معاصرین وبالادستوں کا تعاون بھی حاصل رہا، دارالعلوم میں یہ میرا پہلا سال تھا اور رہائش رواق خالد کمرہ نمبر ۲۴ میں تھی، حضرت صدرِ محترم حضورِ مدنی دامت برکاتہم کی گھن گرج سے جملہ حلقے لرزاں رہتے تھے، بنیان اور لنگی میں، ننگے سر اور ننگے پاؤں، رواق خالد سے مطبخ کی جانب سرپٹ دوڑنا خوب یاد ہے، بدحواس غول کے غول طالبِ پناہ ہوتے اور ایک منظر دیدنی پیدا ہوتا، حضرت والا مدظلہ کے دستِ عبرت کا ذاتی تجربہ تو نہیں ہوا، تاہم دوسروں پر یہ برقِ اصلاح گرتے خوب دیکھی ہے۔

نیابتِ اہتمام

سالِ آئندہ ہفتم اولیٰ میں پہنچا، تو آپ نیابتِ اہتمام کے لیے منتخب ہوئے، میرے جیسا ''کشت حرف کا شہید'' اور ایوانِ بالا کی یہ خبریں! رہائشی کمرہ، مسجد قدیم اور درس گاہ، بس یہی ہمارا طے شدہ مدارِ گردش تھا، احاطے کے باہر جھانکے ہوئے ہفتوں گزر جاتے تھے، لیکن بھلا ہو درس گاہ کے ''گستاخ طبع'' ساتھیوں کا، جنھوں نے حضرت الاستاذ مولانا مدراسی دامت برکاتہم کو گھیر لیا اور تازہ ترقی پر لڈو کے طالب ہوئے، نیابتِ اہتمام کا عہدہ ہر دو حضرات کو تفویض ہوا تھا۔

پہل کاری

مفوضہ ذمے داریاں ہمیشہ آپ کی چھاپ سے درخشاں رہیں، ہر دفتر میں آپ کی بہترین یادگاریں ہیں، انتظامی صیغے میں نیک نامی کی بنیادی وجہ پہل کاری ہے، میرِ کارواں، حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند دامت برکاتہم نے تعزیتی وتأثراتی صوتی پیغام میں حضرت کے حوالے سے

خوب فرمایا ہے کہ اگر معاون مہتمم نو بجے آمد درج کراتا ہے، تو ملازمین کیوں کر لیٹ ہو سکتے ہیں! آمد میں سبقت اور متعلقہ معاملات کی انجام دہی میں پہل کاری سے نظام سنورتا ہے، آپ کے اس معمول نے دفتروں کی فضا کے حسن و پاکیزگی کو دوبالا کیا۔

باز پرس منتظم

حجۃ الاسلام، حضرت الامام محمد قاسم نانوتوی علیہ الرحمہ کا یہ مقولہ شہرۂ آفاق ہے کہ: ''جس کا پیر ''ٹرّا'' (ٹرٹر کرنے والا، یعنی روک ٹوک کرنے والا) نہیں ہوتا، اس کی اصلاح نہیں ہوتی۔'' انتظامی امور میں بھی جزوی فرق کے ساتھ یہ اُفتادنا گزیر ہے، باز پرسی آپ کی طبیعت کا حصہ تھی، اس پہلو سے متعلق ماتحتوں کی بیان کردہ داستانیں احاطے کی گردش کا حصہ ہیں۔

چند ماہ قبل مہمان خانہ دارالعلوم دیوبند میں اساتذۂ دارالعلوم کی اہم اور آپ کی حیاتِ مستعار کی آخری نشست ہوئی تھی، جس میں لاک ڈاؤن کے دور کی منظور شدہ تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں کا جائزہ مقصود تھا، حضرت والا چوں کہ متعلقہ کمیٹی کے سربراہ تھے، اس لیے آپ نے مختلف تجاویز سامنے رکھیں، ان میں ایک نئی بات یہ تھی کہ اساتذہ کے لیے ایک موضوع طے کیا جائے اور اس پر مطالعہ کا مکلف بنایا جائے اور پھر ایک میعاد میں اس کے لیے جائزہ اجلاس بھی بلایا جائے، لیکن دیگر اکابر کو اس رائے پر تحفظات تھے، بات آئی گئی ہوگئی، یہ ''میعادی جائزہ اجلاس'' کا جو اصرار آپ کو تھا، یہ اسی طبیعت کا اثر ہے، جس کو اوپر باز پرس اور احتساب سے تعبیر کیا گیا اور جو انتظامی زندگی کا سب سے ضروری زادِراہ ہے۔

معاصرین کی نسبت بصیرت وفراست

ذمے دار کو ماتحتوں کے سوا معاصرین اور بالا دستوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے، اول الذکر سے کام لینا سہل ہے، لیکن معاصرین اور بڑوں کا معاملہ صبر آزما ہوتا ہے، تکمیلِ ادب کی درس گاہ میں برقی پنکھے قدیم تھے، سست گام ہونے کی وجہ سے مفیدِ مطلب بھی نہیں تھے اور شور مستزاد تھا، یہ پنکھے استاذِ گرامی حضرت مولانا نور عالم خلیل امینیؒ کے ملاحظے میں تھے، حسبِ عادت وہ اُن کو اپنے مخصوص و عالم گیر فقروں سے بھی نواز چکے تھے، گرمی زیادہ ہوئی، تو آپ نے ان کی تبدیلی کے لیے درخواست جمع کرائی اور تصدیق کی مد میں اپنے دستخط ثبت فرمائے، درخواست دستوری مراحل کی نذر ہوکر برقیات میں کہیں رہ گئی، اس دوران حضرت کو یاد آیا، طلبہ کے جواب پر یکا یک برہم ہوگئے اور بہت ہی

برأفروختہ ہوئے، یہاں تک کہ ہم سب کو فوری طور پر درس گاہ بدر کیا اور فرمایا کہ دفتر اہتمام جاؤ اور اسی وقت مطلوبہ پنکھوں کا نظم کرو، ہم ''اوسان خطا'' عالم میں دفترِ اہتمام پہنچے، جہاں ہماری دادرسی کے لیے نائب مہتمم حضرت مولانا قاری عثمان صاحب تشریف فرما تھے، ماجرا سنا اور ہنگامی صورت حال سے آگاہ ہوئے۔

بلاشبہ ایک منتظم کے لیے ایسے لمحات امتحان آمیز ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ ہر مے خوار کے لیے دستورِ مے خانہ جداگانہ ہوسکتا ہے، لیکن آدابِ مے خانہ کتنی لچک کی گنجائش رکھتے ہیں، اس کے لیے فراست وبصیرت دونوں درکار ہیں، آپ نے برقیات کے ملازمین کو حکم دیا کہ..... کچھ عمدہ نئے پنکھے اُتارو اور ابھی تکمیلِ ادب کی درس گاہ میں نصب کرو، اس تدبیر سے صورت حال فوری طور پر معمول پر آگئی اور اُن نئے پنکھوں کی تیز گام ہوا میں باقی سبق کی تکمیل ہوئی۔

حق گوئی

ہم نے راست گوئی میں آپ کو بے باک پایا، خلافِ اصول گفتگو کا تحمل نہیں تھا، سرِ مجلس ٹوکنے کی روایات سب کے علم میں ہیں، اُصول اور نکتے کی بات کہتے تھے، بہت پہلے کا واقعہ ہے، تبلیغ کی ایک کلیدی شخصیت نے مادرِ علمی میں طلبہ کے سالانہ اجتماع کے موقع پر خواص کی نشست کے دوران مبنی برغلو بحث چھیڑ دی، تو آپ نے فضا کے مثبت رنگ کے علی الرغم اس کا بروقت نوٹس لیا اور اُن کو وضاحت پر مجبور کیا، ان چیزوں میں لحاظ اور مروت کے قائل نہیں تھے۔

ایک بزرگ' مسلک کے پس منظر میں توسیعی خیالات کے حامل تھے، ایک پروگرام میں معیت کا اتفاق ہوا، انھوں نے حسبِ توقع اپنے توسیعی ذہن کے مطابق فرقوں اور مسلکوں کو بے مہار قابلِ تاویل قرار دیا، تو آپ نے اُن سے بھی تیز وتند اور دراز نفس بحث اسی وقت کی، مذکورہ شخصیت کے پاس حضرت کے اس سوال کا جواب نہیں تھا کہ کیا خوارج، معتزلہ اور شیعہ کے لیے بھی تاویل کی جائے؟

ہم نے ''النادي'' کے پروگرام کی تیاری بڑے جوش وخروش سے کی، ایک مکالمہ دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے موازنے پر تھا، جس میں ثانی الذکر کی تحقیر وتنقیص نمایاں تھی، تیاری جائزے میں نظر سے گزرا تو برہم ہوگئے، سب کی فہمائش کی اور اس مکالمے کو سرے سے منسوخ کرایا۔

راست بازی

سب کہہ رہے ہیں کہ انتظام وانصرام میں آپ بے نظیر تھے، لیکن یہ امتیاز دراصل ہزار

خوبیوں کی کوکھ سے جنم لیتا ہے، ہر شخص اچھا منتظم نہیں ہوسکتا، اس باب میں نیک نامی کا سفر دیانت داری، منصف مزاجی، مضبوط کردار، اعلیٰ اخلاق، بے لوث خدمت اور ذاتی مفاد کی قربانی سے ہوکر گزرتا ہے، یہ صفات ہوں تو آپ بھی مثالی منتظم بن سکتے ہیں، کوئی کہہ رہا تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کی حالیہ دعوت میں داعی کے نمائندوں نے کھانا حضرت امیر الہندؒ کے گھر بھی پہنچادیا تھا، اطلاع ملنے پر آپ نے یہ کہہ کر معذرت کی اور کھانا بھی واپس کیا کہ دعوت صرف میری تھی، میں شرکت کرچکا، میرے اہلِ خانہ کی دعوت نہیں تھی۔

موطا امام مالکؒ کا درس

دارالحدیث میں موطا امام مالک کا درس دیتے تھے، یہ سلسلہ دراز ثابت ہوا، فقہی بحثوں میں جدال کے رنگ سے بچ نکلنا آسان نہیں، مجبوری بھی ہے کہ محدثین نے انتخابِ احادیث میں اپنے فقہی ذوق اور مسلکی وابستگی کو پیش نظر رکھا ہے، ایسی صورت حال کے ردِعمل میں فطری طور پر تیزی درآنے کا امکان غالب ہوتا ہے، حضرت کے یہاں یہ رنگ نہیں تھا، ائمہ کے احترام کا خاص اہتمام، ان کے دلائل کے تجزیے میں دل کش شائستگی، اپنے مستدلات کی سنجیدہ توضیح، نزاعی مباحث میں شیریں گفتاری اور نرم خوئی' آپ کے درس موطا کے امتیازی خدوخال تھے، پھر غیر متعلق گفتگو سے اجتناب، متعلقہ پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو، حلِ کتاب کے لیے درکار حوالوں پر اکتفا، آپ کے درس کو امتیاز کے ساتھ حسن وخوب صورتی اور زیب وزینت دیتے تھے۔

مثالی فرزندان.....تربیت بھی اور دستِ غیب کا تحفہ بھی

حضرت والا علیہ الرحمہ کے دونوں فرزندان کی حیرت انگیز علمی وفکری کامیابیوں نے تربیتِ اولاد کی بحث کو نیا حوالہ دیا ہے، نقارۂ خدا بہ اتفاق اس تاریخی شاہ کار کو اُن کے والد ماجد کی تگ ودو سے منسوب کرتا ہے، لیکن یہاں بات پوری نہیں ہوتی، تعلیم وتربیت کے ماہرین نے علمی میدانوں میں نمایاں کامیابی کی کلید کو تین چیزوں کا ثمرہ قرار دیا ہے: ۱۔ بہتر سرپرستی، ۲۔ متعلم کا ذاتی ذوق، ۳۔ دستِ غیب کی فیاضی۔

ایسا نہیں ہے کہ حضرت قاری صاحب علیہ الرحمہ کی تربیت کی فہرست میں یہی دو نام ہیں، ہم یہ توجیہ بھی نہیں کرسکتے کہ اُن کی نسبت نگرانی میں فرق رہا، کیوں کہ وہ سب اُن کے قریب ترین اعزا تھے، خود میں نے ان میں سے بعض کو اس وقت پڑھایا ہے جب میں معین مدرس تھا، سرپرستی، نگرانی،

چھان بین، جز وکل پر نزدیکی نظر، یہ سب چیزیں تھیں، لیکن نتائج؟ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک! یہاں ذاتی ذوق کی توجیہ اُبھرتی ہے۔

ان دو عناصر کے علاوہ اہلِ نظر نے ایک تیسرے عنصر کی دریافت کی ہے اور میرے نزدیک حضرت قاری صاحب علیہ الرحمہ کے گھرانے کو ''ہمہ آفتاب'' اسی جوہر نے بنایا ہے، کہتے ہیں کہ مدرس اگر طلبہ کے تئیں مشفق، ہم درد اور غم خوار ہوتا ہے، تو اس کی برکتوں سے اولاد بہرہ ور ہوتی ہے، منقول ہے کہ برہان الائمہ عبد العزیز بن مازہ کے یہاں تلامذہ کا ہجوم تھا، ان سے فارغ ہوتے تو تاخیر بھی ہو جاتی اور تکان بھی، دونوں صاحب زادوں نے اس کا گلہ کیا اور اپنے اسباق مقدم کرنے کا اصرار کیا، والد گرامی نے ان کو سمجھایا کہ مہمانانِ رسول دور دراز سے آئے ہیں، ان کا حق مقدم ہے، اس خیر خواہی کی برکت تاریخِ علم وفقہ نے یوں محفوظ کی کہ دونوں صاحب زادے آفتاب و ماہتاب ہوئے، ایک الصدر الشہید حسام الدین کہلائے اور دوسرے الصدر السعید تاج الدین۔ (تعلیم المتعلم، ص:۸۱)

ہمارے عہد کو زینت دینے والے یہ دونوں نام: مخدومِ گرامی قدر، فقیہ ومحدث، حضرت مفتی سید محمد سلمان منصور پوری دامت برکاتہم اور برادرِ گرامی حضرت مفتی سید محمد عفان منصور پوری مدظلہ اسی دستورِ غیب کی فیاضی کا مظہر ہیں، جس کی راہ حضرت علیہ الرحمہ کی مثالی شفقت، ہم دردی، غم خواری اور خیر خواہی نے بہت پہلے ہموار کر دی تھی۔

ربِ کائنات اُستاذِ گرامی قدر کا بہترین اکرام فرمائے، جنت الفردوس کو ٹھکانہ بنائے، اپنے محبوب ﷺ کا قرب نصیب کرے، جملہ خدمات کو صدقاتِ جاریہ بنائے، دار العلوم دیوبند اور جمعیت علمائے ہند کو ان کا بدل عطا فرمائے، جملہ اہلِ خانہ اور متعلقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

سلام کے مسنون ومکمل کلمات!

ادارہ

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

❶:۔''السلام علیکم'' کی بجائے''سلام'' اور''وعلیکم السلام'' کی بجائے ''والسلام'' کہنا کیسا ہے؟

❷:۔ملاقات اور گفتگو کے آخر میں''خدا حافظ'' کہنا از روئے شرع ثابت ہے؟ اگر نہیں تو گفتگو اور ملاقات کے اختتام پر کیا کہنا مسنون ہے؟

مستفتی: عبداللہ

الجواب باسمہٖ تعالٰی

❶:۔واضح رہے کہ شریعتِ مطہرہ میں سلام کے مخصوص الفاظ ہیں، جن میں سب سے مختصر مسنون سلام''السلام علیکم'' یا''سلام علیکم'' ہے۔

اور اس میں سب سے زیادہ کامل واکمل سلام''السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته'' ہے۔

اور صرف''سلام'' یا''تسلیم'' سے سلام شمار تو ہوگا، لیکن وہ مسنون سلام نہیں ہوگا۔

اسی طرح سلام کے جواب میں مماثلت یا سلام کے الفاظ سے زیادہ الفاظ میں جواب دینا چاہیے، پس''والسلام'' سلام کے مختصر الفاظ سے بھی کم الفاظ پر مشتمل ہے، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ کم از کم جواب میں''وعلیکم السلام'' کہا جائے، اگرچہ جواب صرف''والسلام'' کہنے سے مکمل ہو

جائے گا، لیکن سنتِ جواب سے محروم رہے گا۔

❷:۔ ملاقات اور گفتگو کے آخر میں ''خدا حافظ'' کہنا جائز ہے، بشرطیکہ اس کو سلامِ وداع یعنی رخصتی کے سلام کے قائم مقام نہ سمجھا جائے، کیونکہ اس کے معنی میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

البتہ رخصتی کے وقت سلامِ وداع سے پہلے مسنون ہے کہ ''اَسْتَوْدِعُ اللهَ دِيْنَكَ، وَاَمَانَتَكَ، وَاٰخِرَ عَمَلِكَ'' یا ''اَسْتَوْدِعُ اللهَ دِيْنَكَ، وَاَمَانَتَكَ، وَخَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ'' کہا جائے۔ فتاویٰ شامی میں ہے:

''ثم رأيت في الظهيرية ولفظ السلام في المواضع كلها: السلام عليكم أو سلام عليكم بالتنو ين، و بدون هٰذين كما يقول الجهال لا يكون سلاما.''

(فتاویٰ شامی، فصل فی البیع، ص:۴۱۶، ج:۶، ط:سعید)

عمدۃ القاری میں ہے:

''وأقل السلام: السلام عليكم، فإن كان واحدا خاطب والأفضل الجمع لتناولهٖ ملائكته، وأكمل منه زيادة، ورحمة الله وبركاته اقتداء بقولهٖ عزوجل: رحمة الله و بركاته عليكم أهل البيت .(هود:۱۱)۔''

(عمدۃ القاری، باب بدء السلام، کتاب الاستیذان، ص:۳۵۸، ج:۲۲، ط:دار الکتب العلمیہ)

وفیہ ایضا:

''والأفضل الأكمل في الرد أن يقول: وعليكم السلام ورحمة الله و بركاته.''

(عمدۃ القاری باب بدء السلام، کتاب الاستیذان، ص:۳۵۹، ۳۵۸، ج:۲۲، ط:دار الکتب العلمیہ)

وفیہ ایضا:

''معنى الآية إذا سلم عليكم المسلم فردوا عليه أفضل مما سلم أو ردوا عليه بمثل ماسلم به، فالز يادة مندو بة والمماثلة مفروضة .''

(عمدۃ القاری، باب السلام من اسماء اللہ تعالیٰ، کتاب الاستیذان، ص:۳۶۴، ج:۲۲، ط:دار الکتب العلمیہ)

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

''(دوم) (الفاظِ سلام) (مسنون) ''سلام'' یا ''السلام'' کا لفظ ''علیك'' یا ''علیکم'' کے ساتھ کہے۔ (جائز) صرف سلام یا تسلیم، اس لیے کہ یہ لفظ قرآن میں مذکور مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور، پس صرف سلام یا تسلیم پر اکتفاء کرنے والا

ثوابِ سنت سے محروم رہے گا۔'' (فتاویٰ رحیمیہ، مسائلِ شتیٰ، ص: ۴۸۲، ج: ۱۰، ط: دارالاشاعت)

جامع الترمذی میں ہے:

''عن ابن عمرؓ قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا ودع رجلا أخذه بيده، فلايدعها، حتى يكون الرجل هو يدع يد النبي صلى الله عليه وسلم و يقول: ''اَسْتَوْدِعُ اللهَ دِيْنَكَ، وَاَمَانَتَكَ، وَاٰخِرَ عَمَلِكَ.''

(جامع الترمذی، باب ماجاء مایقول اذا ودع إنسانا، ابواب الدعوات، ص: ۱۸۲، ج: ۲، ط: قدیمی)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہ
ابوبکر سعید الرحمٰن	محمد انعام الحق	عبداللہ خدا بخش
	الجواب صحیح	تخصصِ فقہِ اسلامی
	محمد شفیق عارف	جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

نقد و نظر

ادارہ

یادداشت: پارلیمانی معرکۂ اسلام و قادیانیت

حضرت مولانا حکیم عبدالرحیم اشرفؒ۔ تدوین نو: ڈاکٹر زاہد اشرف صاحب۔ صفحات: ۲۲۴۔ مکتبۃ المنبر۔ زیر انتظام: عبدالرحیم اشرف ٹرسٹ، لاہور۔

پاکستان کی قومی اسمبلی میں ۱۹۷۴ء کو جب قادیانیت کا مسئلہ زیر بحث تھا تو حضرت مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحبؒ نے قادیانیوں کی کتابوں سے ان کے کفریات کو جمع کیا، اصل کتابوں کا عکس لگایا، اور اس کا ابتدائیہ لکھ کر ایک کتابچہ تیار کرا کر تمام اراکینِ اسمبلی سے ملاقات کر کے ان کو یہ رسالہ دیا، جس سے ہر رکن اسمبلی قادیانیوں کے کفر پر مطلع ہوا۔ اس پر اُس وقت کے اکابرین نے آپ کے اس جذبہ کو خوب سراہا۔

اس کے علاوہ بھی حکیم صاحب نے قادیانیت پر کئی اور رسائل لکھے ہیں، جیسے: ۱:۔قادیانی غیر مسلم کیوں؟، ۲:۔مرزا غلام احمد کے پمفلٹ ''ایک غلطی کا ازالہ'' کی ضبطی، ۳:۔قادیانیوں سے پہلا خطاب، ۴:۔قادیانی اور مسلمان۔ یہ تمام رسائل ''احتسابِ قادیانیت'' کی جلد نمبر: ۳۸، صفحہ: ۲۹ سے ۱۷۲ تک میں موجود ہیں۔ ضرورت تھی کہ اس دستاویز کو کتابی شکل میں شائع کیا جاتا۔ آپ کے صاحبزادہ حکیم زاہد اشرف صاحب نے بڑی محنتِ شاقہ کے بعد اس دستاویز کو زیورِ طبع سے آراستہ کیا ہے، اس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ پر یہ دستاویز ایک عمدہ اضافہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے مرتب اور اُن کے معاونین کو جزائے خیر دے۔

وہ پروانے محمد (ﷺ) کے

حضرت مولانا جمیل الرحمٰن عباسی۔ صفحات: ۳۰۴۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: مکتبہ عشرہ مبشرہؓ، لاہور۔ ملنے کا پتا: مکتبہ صفدریہ، متصل مدینہ مسجد، ماڈل ٹاؤن بی، بہاولپور

حضرت مولانا جمیل الرحمٰن عباسی صاحب کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بہت ہی خوبیوں سے مالا مال کیا ہے، آپ جہاں بہترین مدرس، خوش الحان واعظ، پختہ مناظر ہیں، وہاں آپ بہترین قلمکار بھی ہیں، زیرِ تبصرہ کتاب ''وہ پروانے محمد ﷺ کے'' اشاعتِ دوم آپ کے اُن مضامین اور کالموں کا مجموعہ ہے جو آپ نے روز نامہ اسلام کے لیے لکھے، اس کتاب میں پچاس صحابہ کرامؓ کا معطر تذکرہ، صحابہ کرامؓ کی مدح سرائی اور ایمان افروز مضامین اور ولولہ انگیز اشعار کو جمع کیا گیا ہے۔

چونکہ اخبار کے لیے کالم لکھنے اور مستقل کتاب تالیف کرنے میں فرق ہے، لیکن اس فرق کو یہاں ملحوظ نہیں رکھا گیا، اس لیے صحابہ کرامؓ کی سوانح میں یکسانیت نہیں ہے۔ کہیں کسی صحابیؓ کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات لکھی گئی ہے اور کسی صحابیؓ کے تذکرہ میں ان کو چھوڑ دیا گیا ہے، اسی طرح کسی صحابیؓ کی کل مرویات کی تعداد لکھی گئی ہے، اور کسی صحابی کے تذکرہ میں مرویات کی تعداد کو ذکر نہیں کیا گیا، مزید یہ کام بھی کرلیا جاتا کہ احادیث کی تخریج، جلد مع صفحہ نمبر درج کی جاتی تو بہت اچھا ہوتا، اسی طرح احادیث پر اعراب لگائے جاتے، تاکہ عام پڑھنے والا بھی احادیث کو آسانی سے پڑھ لیتا۔ بہرحال مجموعی لحاظ سے کتاب عمدہ ہے، کاغذ بھی مناسب ہے، ٹائٹل بھی خوبصورت ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت مولانا موصوف کی اس محنت، کوشش اور کاوش کو قبول فرمائے اور قارئین کے لیے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے محبت کا ذریعہ بنائے، آمین

تقاضائے ایمان در معاویہ بن ابی سفیان (رضی اللہ عنہما)

حضرت مولانا حافظ محمد اقبال رنگونی۔ صفحات: ۳۰۰۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: ادارہ اشاعتِ اسلام مانچسٹر، برطانیہ۔ پاکستان میں ملنے کا پتا: صدیقی ٹرسٹ، المنظر اپارٹمنٹ، ۴۵۸، گارڈن ایسٹ، نزد لسبیلہ چوک، کراچی

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جماعت، وہ جماعت ہے جس نے آپ ﷺ سے قرآن کریم، سنت نبویہ اور مکمل دین سیکھ کر آگے اپنے شاگردوں کے ذریعے اُمت تک پہنچایا، گویا صحابہ

کرامؓ دینِ اسلام کے عینی شاہد ہیں۔ نزولِ وحی کو انہوں نے دیکھا، حضور اکرم ﷺ کو قرآن کریم پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے دیکھا، اگر صحابہ کرامؓ کے بارہ میں ذرہ بھی بدگمانی آ گئی تو پورا دین مشکوک ہوجائے گا، اس لیے علمائے کرام نے لکھا ہے کہ صحابہ کرامؓ کی سیرت اور اُن کے فضائل ومناقب کو جانچنا ہوتو قرآن کریم اور احادیثِ رسول اللہ ﷺ کے تناظر میں دیکھا اور پرکھا جائے، صحابہ کرامؓ تاریخ کا موضوع نہیں۔

بہرحال زیرِتبصرہ کتاب ''تقاضائے ایمان درمناقبِ معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما'' میں ابتداءً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت اور مقام کو قرآن وسنت کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے اور پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حالات، مقام اور فضیلت کو احادیث اور علمائے کرام کی تقریظات، توضیحات اور ملفوظات کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ تحریر کا انداز علمی ہے اور کتاب مستند حوالوں سے مبرہن ہے۔

کاغذ، جلد، طباعت ہر ایک عمدہ ہے۔ اُمید ہے کہ اس کی قدر افزائی کی جائے گی۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....